LABEL

موضوع ادب

مصنف " چکبست (برج نرائن)

عنوان "

ترتیب "

اُردو مقالے

Rs 3/-

Comp.

مضامینِ چکبست

ایوان ادب اردو حویلی قدیم حیدرآباد دکن

J. & K. UNIVERSITY LIB.
Acc No 46633
Date 11.7.63

ALLAMA IQBAL LIBRARY
46633

قیمت
دو روپیہ آٹھ آنے

CHECKED

J & K UNIVERSITY LIB.
Acc No
Date

پنڈت دیاشنکر کول۔ نسیم

جبکہ دماغی اشغال سے روز بروز نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ دماغی جوہر جو انسان کو دنیا کے جنجال سے نجات دیکر ایک روحانی خوشی کا سرمایہ بہم پہنچاتے ہیں مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ زندگی کے معنی صرف کھانا پینا، دل لگی مذاق میں وقت گذارنا، بائسکل پر کوچہ گردی کرنا، یا گھر میں بیٹھ کر فلش کھیلنا رہ گئے ہیں۔ نقد حیات کسی اور قابل نہیں سمجھا جاتا ہے سوائے اس کے کہ جسمانی آسائش اور شکم پروری پر لٹایا جائے۔ تہذیب کے معنی یہ خیال کیے جاتے ہیں کہ آدھے سر پر ٹوپی ہو، مانگ نہایت تکلف کے ساتھ نکلی ہو، شیروانی جسم پر چسپاں ہو، اچکن کے بٹن کھلے ہوں اور قمیص کا فرنٹ قیامت برپا کر رہا ہو چال میں وہ لوچ ہو کہ معلوم ہو ہوائی تہذیب میں جھونکے کھاتے جا رہے ہیں۔ اس حالت میں ایسے مضمون کا چھیڑنا جس کا مذاق دلوں سے بالکل اٹھ گیا ہے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ سوائے اسکے کہ بے درد و بے انصاف کہیں کہ پرانے مردے اکھیڑنے سے کیا فائدہ۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تعصب کی عینک آنکھوں سے اتار کر رکھ دی جائے۔ اور ذرا نظر انصاف

سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان بزرگوں کے حالات جنھوں نے ہماری قوم کا نام روشن کیا اور جن کے کمالات نے ہندوستان میں اعزاز کشمر کی بنا ڈالی خالی از دلچسپی نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بزرگوں کی زندگی کے حالات پر ایسا اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ ان کے کمالات کا کسی خاص علم و فن کے دائرے میں اندازہ کرنا دشوار ہے۔ مثلاً سب جانتے ہیں کہ پنڈتانِ کشمیر اپنی ذہانت اور جودتِ طبع کے لئے ہندوستان میں ہمیشہ سے مشہور رہیں۔ مسلمانوں کے دورانِ حکومت میں جو ذریعے نام پیدا کرنے کے تھے ان سب سے ہمارے بزرگوں نے ایک حد تک فائدہ اٹھایا۔ شعر و سخن کا مذاق جو کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں برابر جاری تھا ہمارے بزرگوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ جب تک اردو زبان اپنی عہد طفولیت میں تھی اور فارسی کا رنگ چوکھا تھا اس وقت ہماری قوم میں فارسی کے ایسے ایسے شاعر پیدا ہوے کہ جن کی ذات پر ہر شخص کو ناز ہو سکتا ہے۔ ان کا کلام زمانہ کی ناقدر دانی سے تلف ہو گیا۔ لیکن جو اشعار اب تک سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن عالی دماغوں نے شاعری کے فن میں کیا کمال حاصل کیا تھا اور شعر و سخن کے مذاق کو کیا معراج دی تھی۔

پنڈت سومناتھ صاحب منتی نے ایک قصیدہ عرفی کے ایک مشہور قصیدہ کے وزن پر کہا تھا۔ اس کے دو شعر اب تک یادگار ہیں۔ واقعی لاجواب ہیں۔

عرفی کے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

صبحدم چون میدمد این صور شیون زائے من ۔ آسمان صحنِ قیامت گرد داز غوغائے من

پنڈت صاحب نے اس مطلع کی جوڑ پر کیا خوب مطلع کہا ہے ؎

بسکہ حسرت میچکد از نالہ آوائے من ۔ صحنِ محشر بزم خاموشاں شد از غوغائے من

اور دوسرا شعر تو اس پایہ کا ہے کہ اس کا جواب عرفیؔ کے قصیدہ میں بھی مشکل سے ملے گا۔ ؎

ہمتِ بالا کیم از کون و مکاں بگذشتہ است ٭ بر فضائے لامکاں پر می زند عنقائے من

کیا بلند پروازی اور معنی آفرینی کی داد دی ہے۔ اگر صفائے بندش اور پاکیزگیٔ زبان کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایران نژاد کی فارسی ہے۔ اسی طرح پنڈت صاحب نے حافظؔ کے ایک مشہور شعر پر مصرعے لگائے ہیں۔ ؎

ساقیا چوں بطِ مے چند در آئی بخروش ٭ کہ بیا در چمنِ خلد وے کوثر نوش

گرچہ او خود ہمہ نوش است و لیکن من دوش ٭ کردہ ام توبہ بدستِ صنمِ بادہ فروش

کہ دگر مے نہ خورم بے کف بزم آرائے

جب تک کہ زبان پر قدرت کاملہ نہ حاصل ہو اس وقت تک ایسے صاف مصرع زبان سے نہیں نکل سکتے۔ پہلے تین مصرعوں کی فارسی اور حافظؔ کی فارسی میں سرِ مو فرق نہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کمخواب میں ٹاٹ کا جوڑ لگایا گیا ہے بلکہ حریر میں حریر کا پیوند ہے۔ اسی طرح دیگر متفرق اشعار لوگوں کے ورد زبان ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے فارسی میں کیسی لیاقت پیدا کی تھی اور شاعری میں کیا کمال حاصل کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کی زندگی کے حالات کا پتہ چلنا اور ان کے کلام کا ترتیب پانا امر محال ہے۔

ایک مجموعہ "چمنستانِ کشمیر" کے نام سے چھپا ہے۔ لیکن اس چمنستان میں زیادہ تر خزاں رسیدہ پھول نظر آتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کا کلام اس میں نہیں ملتا معلوم ہوتا ہے کہ دستیاب نہ ہو سکا۔ لیکن چند ایسے بزرگوار ہیں جن کو مرے ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا اور جن کا کلام قدردانانِ سخن کی خوش قسمتی سے ان کی زندگی میں چھپ گیا ہے۔ ان کی زندگی کے حالات شوق

وجستجو کے دائرے سے باہر نہیں۔ مگر یہ لوگ اس زمانہ کے ہیں جبکہ فارسی کا چراغ جھلملا رہا تھا اور اردو ترقی کے پروبال نکال رہی تھی۔ لہذا ان لوگوں کا کلام جو کچھ دستیاب ہو سکتا ہے وہ اردو میں ہے۔

اس زمرہ میں پنڈت دیا شنکر صاحب نسیم کا نام سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اردو شاعری میں انہوں نے جو کمال حاصل کیا وہ سب پر روشن ہے۔ ان کا سکہ اب تک اقلیم سخن میں جاری ہے۔ اِن کی مثنوی "گلزار نسیم" کی شادابی میں فرق نہیں آسکتا۔

پنڈت دیا شنکر نسیم ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ لکھنؤ آپ کا وطن تھا۔ جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا اُردو فارسی کی تعلیم پائی۔ شعرائے اُردو و فارسی کا کلام نظر سے گذرتا رہا۔ خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا غرض کہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا خاصہ اچھا مذاق پیدا کر لیا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی سخن و آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ انکی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں غزل گوئی کا شوق رہا۔ لیکن جو دل کا ولولہ تھا وہ غزل میں نہ نکل سکا۔ جدتِ طبعی نے کہا۔ ؎

بقدرِ شوق نہیں اپنے تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلیے

مگر وسعت کہاں ملے۔ اُردو شاعری کی کائنات کیا۔ غزل، قصیدہ یا رباعی یا مثنوی۔ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کے اس زمانہ میں چرچے تھے کچھ یہ طرز ایسا پسند آیا کہ خود بھی مثنوی کے کوچہ میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔ مناسبت طبع نے آمین کہا۔ غرض کہ "گل بکاؤلی" کا قصہ جو کہ نثر میں تھا اس کو نظم میں ڈھالا۔ اٹھائیس برس کی عمر میں یہ مثنوی تیار ہوئی

چونکہ گلہائے مضامین سے پر تھی لہٰذا نام "گلزار نسیم" رکھا۔ واقعی اس گلزار کا کیا کہنا تھا۔ ع

"سینچا تھا جسکو خون جگر سے وہ باغ تھا"

اس کے پھولوں کی مہک دور دور پہنچی لیکن جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی۔ اُس وقت اس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب آتش کے پاس اصلاح کے لیئے لیگئے تو انہوں نے کہا کہ " ارے بھائی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھیگا یا تم پڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤں گا" استادِ کامل کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی پھر نظر ثانی کی جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے۔ بلکہ جو مطلب چار شعروں میں ادا ہوتا اس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کیا۔ اس صورت سے "گلزار نسیم" کو خار و خس سے پاک کیا اور آتش کے پاس لے گئے۔ استاد نے شاگرد کی محنت پر آفریں کی اور اصلاح کا قلم اٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحیں نسیم نے نہ مانیں اور اشعار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا۔ مثلاً مثنوی کا ایک شعر تھا ۔

قلیاں پئے مشکبو دھواں دھار بیڑے چکنے پان کے مزے دار

آتش نے دوسرا مصرع اس طرح بدلنا چاہا۔ ع بیڑے چکنے بہت مزیدار۔ لیکن نسیم کو یہ اصلاح نہ پسند آئی اور مصرع کی تبدیلی مناسب نہ سمجھی۔

غرض کہ آتش کی نظر ثانی کے بعد مثنوی طبع ہوئی۔ شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ زمانہ نے پوری طور سے قدر کی۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا اب "گلزار نسیم" کے جابجا چرچے ہونے لگے۔ جواہر سخن کے پرکھنے والے جان گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پروئے ہیں۔ نسیم کو بھی شہرت عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے

دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی۔

لیکن سخن شناس جانتے ہیں کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کی جوڑ پر مثنوی کہی لیکن بالکل دوسرے رنگ میں کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چیں نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اپنے رنگ میں یکتا ہیں، تو یہ اپنے طرز میں فرد ہیں اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو۔ اگر باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ، پسند ہے تو "گلزار نسیم" کی سیر کرو دیکھو! فراق یار میں صدمہ گذرنے کا مضمون ایک ہی ہے۔ دونوں استادوں کی طبیعت اس پر برابر لڑی ہے مگر دونوں کے انداز سخن پر خیال کرو۔

میر حسن

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے سونے لگی

جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے

کسی نے اگر بات کی۔ بات کی
یہ نکلی جو پوچھی کہی رات کی

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

جو پانی پلا تو پینا اسے
غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے

نسیم

سنسان تھی دم بخود تھی رہتی
کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی

رکھتی تھی جو بھوک پیاس لب میں
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ
کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

یک چند جو گذری بے خور و خواب
زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب

صورت میں خیال رہ گئی وہ | ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر | فانوس خیال بن گیا گھر

دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں شاعری کا حق ادا کیا ہے۔ میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل پر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شب ہجران کی بیقراری کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعاروں کی ترکیب، تشبیہوں کی نحیفگی مصنف کی طبعیت کے پر زور ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ نازک خیال اور بلند پروازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے۔ جہاں پہنچتے ہوے ہمارے طائر خیال کے پر جلتے ہیں اگر صورت حال کا بیان میر حسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میر حسن کہتے ہیں:۔

سب اعضا بدن کے موافق درست | ہر ایک کام میں اپنے چالاک و چست
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام | قیامت کرے جسکو جھک کر سلام

نسیم اس مضمون کو اپنے رنگ میں ادا کرتے ہیں:۔

دن، دن اسے ہو گیا قیامت | بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت
چلتی تو زمین میں سرو گڑتے | باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

میر حسن کے اشعار ناخن بر جگر ہیں۔ ان کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے۔ نسیم کے اشعار الفاظ کی شستگی اور ترکیب الفاظ کی چستی سے تاثیر کا طلسم بنے ہوے ہیں۔ ایک کی زینت حسن صورت سے ہے۔ دوسرے کی شان لطف معنی سے قائم ہے۔ میر حسن سخن آفریں ہیں۔ نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں۔ استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے۔ مگر اتنا کہنا نا انصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام میں ہے

وہ نسیم کے کلام میں نہیں۔ وہی کلام درد خیز ہوتا ہے جو درد خیز دل سے نکلتا ہے۔ بایں ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے نسیم کا کلام اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کے طائر شہرت نے پر پرواز نکالے تو کسی خرمن کے خوشہ چین نہ خیال کئے گئے بلکہ خود صاحب طرز کہلائے "گلزار نسیم" کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا خاص حصہ ہے تناسب لفظی ہے۔ تناسب لفظی کی صنعت ہمیشہ اردو شاعروں کے پسند خاطر رہی ہے لیکن کسی نے اس کو اس درجہ کمال پر نہیں پہنچایا جیسا کہ ہم گلزار نسیم میں دیکھتے ہیں۔ چند اشعار تمثیلاً ہدیہ ناظرین ہیں۔ ے

پردہ سے نہ دایہ نے نکالا — پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
پالا تو مفارقت ہے انجام — دانا ہے تو مجھ کو لے مرے دام
چیز ہو اگر تو قصد کیجئے — سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے
سودا ہے مری بکاؤلی کو — ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

اس رنگ کے شعر گلزار نسیم میں کثرت سے ملیں گے۔ واقعی اس رنگ کو خوب نبایا ہے۔ اور طرہ یہ کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ۔ تناسب لفظی کی صنعت کا لطف یہ ہے کہ یہ کہیں پر سے نہ معلوم ہو کہ فلاں لفظ خواہ مخواہ شعر میں بھر دیا ہے کہ دوسرے لفظ سے جوڑ کھا جائے۔ اور یہ جوہر گلزار نسیم میں ہے۔ مثلاً کیا خوب مصرعہ ہے۔ ع

"سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے"

اس مصرعہ میں سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیت دکھا رہا ہے۔ لیکن دونوں لفظ اس خوبی سے آئے ہیں کہ بالکل ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور ملے ہوئے بھی۔ حالانکہ ایک کی رونق دوسرے کی وجہ سے

دوبالا ہے۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ "سایہ" کا لفظ خواہ مخواہ "دھوپ" کے لئے لایا گیا ہے۔ اس رنگ پر چلنا آسان نہیں ہے۔ یہ راہ بڑی کٹھن ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ ہے۔ یہ نسیمؔ کو ہی فخر حاصل ہے کہ کہیں اپنے نئیں لغزش کی ہوا نہ لگنے دی۔ اکثر شعرائے اردو نے اس رنگ میں کہہ کر اپنے کلام کو بے رنگ کر دیا ہے۔ مثلاً امانت کا دیوان بھر اس بیان کی تصدیق کرتا ہے، اس شاعر کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہیں اور طبعیت میں شستگی کا جوہر نہیں۔ لہذا جو شعر اس رنگ میں کہا ہے اسے پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ ایک شعر بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ ؎

بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی — قبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت

سبحان اللہ کیا تناسب الفاظ ہے۔ نیم حکیم اور نیم ملا سنتے تھے یہ نیم شاعر ہیں۔ اس طرح احمد علی شوقؔ ایک لکھنؤ کے شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی ایک مثنوی کہی ہے اور "گلزار نسیم" کا رنگ اڑایا ہے۔ لیکن جو تناسب لفظی نسیمؔ کے لئے جوہر ہے ان کے لئے عیب ہو گیا ہے۔ ایک شعر ان کا یاد آگیا اس کا لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ؎

بیری میں بیر کیڑے پڑ جائیں — پاجی ہیں شریفے سب اجڑ جائیں

خلیل کا بھی ایک شعر اس رنگ میں ہے ؎

کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے میں ڈھیل کی — وہ شمع رو پتنگ اڑاتا ہے شائد آج

ان اشعار کے تمثیلاً پیش کرنے سے مراد یہ ہے کہ تناسب الفاظ کا نباہنا ایک امر دشوار ہے۔ ہر طفل مکتب کا کام نہیں۔ نسیمؔ کو اس رنگ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے وہ کام لیا ہے کہ کلام کی رونق دوبالا

ہوگئی ہے۔ جس پہلو سے الفاظ کو جما دیا ہے" ایسے جمے ہیں کہ ایک حرف کا ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ آتش کا شعر ان کی شاعری پر صادق آتا ہے۔ سے

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اختصار جیسا کہ بیشتر عرض کیا گیا ہے اس مثنوی کا عجیب جوہر ہے واقعی دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ کل مثنوی میں ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملے گا۔ بعض مقامات پر طول طویل مضامین کو اس صفائی سے دو شعروں میں ادا کر دیا ہے کہ کسی قسم کی کوتاہی کا شبہہ تک بھی نہیں گذرتا۔ مثلاً "صحرائے طلسم" کی داستان میں مندرجۂ ذیل دو شعر کتنے پر معنی ہیں، کس قدر اختصار سے پُر ہیں۔ سے

طوطا بن کر شجر پہ جا کر　　　پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر

پتی، پھل، گوند، چھال، لکڑی　　　اس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی

یا ایک مقام پر گفتگو کا اختصار کس خوبی سے نظم کیا ہے۔ سے

پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت　　　پوچھا کہ طلب، کہا قناعت

میر حسن کی مثنوی میں معاملہ برعکس ہے۔ اس میں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے۔ اور یہی اس مثنوی کا ایک بہت بڑا عیب ہے۔

نسیم نے عموماً مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے لیکن اکثر مقامات پر طبیعت نے تکلف کا پردہ اٹھا دیا ہے اور سادگی سے کام لیا ہے۔ ایسے اشعار کم پائے جاتے ہیں۔ مگر جو ہیں وہ لاجواب ہیں اور ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ مثلاً سے

انسان و پری کا سامنا کیا　　　مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے　　　دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے | جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار | اب مان نہ مان تو ہے مختار
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے | مختار ہے جس طرح بنا ہے

علاوہ بریں کلام میں وہ پختگی اور ترکیب میں وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش نلدمن فیضی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے۔ واقعی کیا سنجیدہ و پُرشوکت کلام ہے ؎

پر بحر سخن سدا ہے باقی | دریا نہیں کار بند ساقی
مرغانِ ہوا تھے ہوش راہی | نقش کفِ پا تھے ریگ ماہی
جاگی مرغِ سحر کے غل سے | اٹھی نگہت سی فرش گل سے
یا پنجوں سر پنجۂ وفا تھے | یا مطلع حمزۂ صفا تھے
اے آئینہ دار خود نمائی | دے سرمۂ چشم آشنائی
اک شب کہ تھی خالِ روئے شامت | یا مردم دیدۂ قیامت

غرض کہ تناسب لفظی، اختصار، پختگی کلام، چستی بندش، شوکت الفاظ، پاکیزگی زبان، اس مثنوی کے خاص جوہر ہیں۔ استعاروں اور تشبیہوں سے جو مینا کاری کی ہے اس نے اور حسن دو بالا کر دیا ہے۔

اکثر متعصب مسلمان کہتے ہیں کہ آتش نے نسیم کو یہ مثنوی کہہ کر دے دی تھی۔ میری رائے میں اس دعوے بے دلیل پر چین بہ جبیں ہونا بیکار ہے۔ بلکہ ایک معنی میں یہ بیان ہمارے لئے باعثِ فخر ہے۔ اس سے بڑھ کر نسیم کی شاعری کی تعریف کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا کلام آتش ایسے زبردست استاد کی طرف منسوب کیا جائے۔ حالانکہ سخن شناس اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس بارنگ میں گلزار نسیم ہے، اس رنگ میں آتش نے اپنی زندگی بھر میں ایک شعر نہیں کہا۔ اس موقع پر اردو زبان کے مستند مورخ

محمد حسین آزاد مصنف "آب حیات" کی رائے پیش کرنا خالی از دلچسپی نہیں گو اس مؤرخ سے ہم کو اتنی شکایت ضرور ہے کہ جہاں اپنی کتاب "آب حیات" میں اور شعرا پہ صفحے کے صفحے لکھے ہیں وہاں نسیم کی مثنوی پر رائے زنی کرنے میں دس پندرہ سطروں پر اکتفا کیا ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے وہ انصاف کی نظر سے لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصف مزاج مؤرخ کا دامن تعصب کے داغ سے پاک ہے۔ کیونکہ اس کی رائے "گلزار نسیم" پر منصفانہ ہے "آب حیات" میں یوں لکھا ہے "پنڈت دیا شنکر نے "گلزار نسیم" لکھی اور بہت خوب لکھی۔ ..... اس کی عام و خاص میں شہرت ہے اس کے نکتے اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں، مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ جتنی سمجھ میں آتی ہے اسی پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں واقعی بہت صحیح لکھا ہے۔ جو اس بیان میں شک کرے وہ کافر ہے۔

علاوہ مثنوی کے نسیم کا ایک غزلوں کا چھوٹا سا دیوان ہے۔ لیکن ناتمام۔ بہت سی غزلیں جو تلف ہو گئیں ان کا نام و نشان بھی اس دیوان میں نہیں ملتا۔ لیکن جو کچھ ذخیرہ اشعار کا باقی رہ گیا ہے وہ اب تک قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نسیم کا کلام آتش و ناسخ، ذوق و غالب کے کلام کا ہم پایہ نہیں۔ یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہیں، ان کے برابر کسی کو عروج نہیں ہوا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ نسیم، رند صبا و خواجہ وزیر کے ہم پلہ ضرور تھے۔ اکثر مقامات پر طبیعت کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قیامت کرتی ہے۔ مثلاً ؎

بجز گور غریباں نقش پا تک بھی نہیں آگے
نہیں تک ہر مسافر نے پتہ پایا ہے منزل کا

نسیم اپنے ہی اعمالوں نے گردش ہے زمانہ کی
رواں کشتی پہ آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

اے مرغِ دل تو شاخِ نشیمن سے گر پڑا
حیف آشیاں بلند ہے پرواز پست ہے
تھے محوِ زلف دیدۂ تر دل بھی آ پھنسا
مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخِ گل اک روز جھونکا کھائیگی
جان نکل جائے گی جب تن سے نسیم
گل کو بوئے گل ہوا بتلائیگی

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

طریقِ شعر و سخن میں اگر نہیں اعجاز
قلم کی طرح سے ہر اک شکستہ پا چلتا

اس موقع پر یہ لکھنا غیر مناسب نہیں کہ گو یہ آتش کے شاگرد تھے۔ لیکن آتش کی گرمیِ سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا۔ مگر باوجود اس تصنع کے جو کہ اس رنگ کا خاص جوہر ہے، نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہیں ہے۔ طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزے دار بنا دیتی ہے۔

سنا جاتا ہے کہ وہ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے۔ تیزیِ ذہن و ذکاوتِ طبع کا عجیب عالم تھا، حاضر جوابی تیغِ زبان کی جوہر تھی انہیں صفات خاص نے ان کا وقار ہم عصر شعرا میں قائم کیا۔ اگر یہ جوہر نہ ہوتے تو کون پوچھتا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گو کہ اردو شاعری کے زوال کا زمانہ قریب آ چکا تھا لیکن جیسے بجھنے کے پیشتر چراغ کی روشنی تیز ہو جاتی ہے اسی طرح اس زمانہ نے شعر و سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ باید و شاید۔ آتش و ناسخ

کی جادو نگار طبیعتیں اپنا زور دکھا رہی تھیں۔ انیس و دبیر مرثیہ گوئی کے فن کو عرش پر پہنچا رہے تھے۔ خواجہ وزیر و صبا کی نوجوان و شوخ طبیعتیں اک طرفہ قیامت برپا کر رہی تھیں۔ اس زمانہ میں ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ میں اپنا وقار قائم رکھنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن نسیم اپنے گلہائے مضامین کی خوشبو سے سب کو مست کر دیا۔ ایسے ایسے معرکہ جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی۔ خصوصاً کی حاضر جوابی و موزونی طبع کے سب قائل تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شاعرہ کی صحبت تھی نسیم بھی وہاں موجود تھے۔ شیخ ناسخ نے انکی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرعہ نہیں سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انہوں نے جواب دیا فرمائیے۔ ناسخ نے مصرعہ پڑھا۔ ع

"شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا"

ان کے منہ سے مصرعہ نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرعہ تیار تھا۔ ع

"تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"

اس مصرعہ کا سننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اٹھے اور ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی۔ لیکن نسیم نے خوب ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرہ میں ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرعہ یہ تھا۔ ع

جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

پہلا مصرعہ کچھ مہمل سا تھا۔ نسیم کے منہ سے بیساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرعہ تو خوب ہے لیکن پہلا مصرعہ ٹھیک نہیں۔ وہ صاحب بھی کچھ جلے تن تھے جھنجھلا کے بولے کہ اچھا آپ اس سے اچھا مصرعہ لگا دیجئے۔ یہاں تو مضامین ہر وقت

ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے۔ اسی وقت مصرعہ موزوں کر کے سنا دیا۔ کہ

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں (جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں)

ان کی مشاعرہ میں دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہو گیا۔

ایک روز آتش کے یہاں شاگردوں کا جمگھٹا تھا۔ رند۔ صبا۔ خلیل وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نسیم بھی موجود تھے۔ صبح کا سہانا وقت' برسات کا موسم' مینہ برستا ہوا' عجیب کیفیت تھی۔ موسم بہار سے کچھ ایسی طبیعتیں مست ہوئیں کہ شاگردوں نے آتش سے فرمائش کی کہ استاد اس وقت ایک غزل کہہ ڈالئے۔ گو کہ آتش کا بڑھاپا تھا۔ لیکن طبیعت میں جوانی کا زور بھرا ہوا تھا۔ فی البدیہہ اشعار موزوں کرنے شروع کر دئیے اور کہا کہ لکھتے جاؤ۔ جس غزل کا مطلع ہے۔ ؎

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے ؛ کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

وہ اسی موقع پر کہی گئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے لہرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ان اشعار کی تخمیس شروع کر دی۔ جتنی دیر میں آتش دوسرا سوچتے تھے یہ اس عرصہ میں ان کے پہلے شعر پر مصرعے لگا چکتے۔ اور بعض بعض مصرعے تو واقعی اس انداز سے نکالے ہیں کہ اگر کوئی برسوں فکر میں سرگرداں رہے تو ان سے اچھے مصرعے نہیں لگا سکتا۔ آتش کے دو اشعار کی تخمیس تمثیلاً لکھی جاتی ہے۔ تین مصرعے شروع کے نسیم کے ہیں اور دو مصرعے آخر کے آتش کے۔

نہ خونی کفن ہیں نہ گھائل ہوئے ہیں ؛ نہ زخمی بدن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں
لہو مل کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں ؛ تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

وجود بشر کیا عدم ہی عدم ہے ؛ کہ ہے آدمی جب تلک دم میں دم ہے

شکم پرور حرمِ نازونعم ہے   کرے جتقدر شکر نعمت وہ کم ہے

مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ اشعار پر مصرعے لگائے۔ جب آتشؔ نے غزل ختم کی تو صبا، رند، و خلیل کے چہروں کے رنگ فق تھے۔ ابھی تک یہ لوگ اپنے تئیں اہلِ زبان خیال کرتے تھے اور نسیم کو ہندو سمجھ کر زیادہ وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن اُس روز سب لوہا مان گئے کہ موزونئ طبع ہو تو ایسی ہو اور مضمون آفرینی کا مادہ ہو تو ایسا ہو۔

نسیمؔ کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرہ میں تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعے سے ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے۔ کہ شاعرانِ لکھنؤ ان پر مصرعے لگا کر بھیجیں تینوں مصرعے حسب ذیل ہیں۔

(۱) ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

(۲) اس لئے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت

(۳) من می روم بہ کعبہ دل می رود بہ دیر

اب اہل لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے لگا کر بھیجے جائیں کہ دلی والوں کو بھی یہاں کی شاعری کا قائل ہونا پڑے۔ اگر مصرعے سست لگے تو کرکری ہو جائے گی۔ غرض کہ تین شخصوں کو جو کہ ہر طرح سے اس کام کے لئے موزوں خیال کئے گئے ایک ایک مصرعے پر مصرعہ لگانے کا کام سپرد ہوا۔ پہلا مصرع ناسخؔ کو دیا گیا۔ دوسرا آتشؔ کو اور تیسرا نسیمؔ کو۔ گو کہ اس وقت اور بڑے بڑے شاعر بھی موجود تھے۔ مگر آتشؔ و ناسخؔ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قائم رکھنے کا شرف نسیمؔ ہی کو حاصل ہوا

تینوں استادوں نے جی توڑ کر مصرعے لگائے ہیں۔ ناسخ کا مصرعہ ہے۔

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا
(ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا)

آتش نے کہا۔

حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے
(اسلئے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت)

نسیم کا مصرعہ بھی لاجواب ہے۔

دارم ز دین و کفر بہر یک قدم دو سیر
من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دیر

یہ معرکہ اب تک لکھنؤ میں یادگار ہے۔

مگر افسوس کہ اس صبیب قوم کے ساتھ عمر نے رفانہ کی۔ "گلزار نسیم" کو شایع ہوے چار برس گذرے تھے کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی ہاضمہ کی بیماری نے دفعتاً خاتمہ کر دیا۔ اپنے شعر کے آپ ہی مصداق ہوے۔ ؎

روح رواں و جسم کی صورتیں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

۱۸۴۲ء میں بتیس ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی کسی شاعر نے رباعی کہی۔ ؎

مغموم رکھا مدام دلگیری نے
مارا ہے جوان فلک کی بے پیری نے
واللہ کہ آتش فروغ ناسخ
ٹھنڈی کر دی نسیم کشمیری نے

پنڈت رتن ناتھ در سرشار

اینت "رتن ناتھ در" در ہمہ دانی سمر — آنت فسانہ نگر کان ہمہ ایجاد اوست

شعر فوے اندر دہن صد چمن اندر چمن — نطق زبانِ سخن مرغِ چمن زاد اوست

مصرع پیچیدہ اش عرعرِ بالیدہ اش — معنی پیچیدہ اش طرۂ شمشاد اوست

خامہ بجامہ نہاد زہرہ عطارد بزاد — فکرِ تصور نژاد خلخ نوشاد اوست

بست بہ فکرِ رسا معنیٔ نایاب را — بستنِ بالِ ہما عشوۂ صیاد اوست

مریم او طبعِ بکر عیسیٰ او تازہ فکر — روح قدس رابہ فکر ہمت یاساد اوست

مصرعِ تاریخ باز قدر چنیں داد ساز — سرو چمن زار ناز قصہ آزاد اوست

(قدر بلگرامی)

اہلِ کشمیر میں دو صاحب ایسے گذرے ہیں جن کی شہرت کا دامن قیامت کے دامن کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ ایک پنڈت دیا شنکر نسیم جن کے فیض سے چمنستانِ نظم کو شادابی حاصل ہوئی۔ دوسرے حضرتِ سرشار جنہوں نے حدیقۂ نثرِ اردو میں نئی روشیں نکالیں اور جن کی جادو بیانی کا شہرہ آج ہندوستان بھر میں ہے مگر ہماری بے ہمتی کہ ایسے باکمال کی زندگی کے حالات کا پتہ چلنا ہمارے لئے دشوار ہے۔ اور پھر ایسی حالت میں جب کہ اس کو دنیا سے اٹھے ہوئے کچھ عرصہ نہیں گذرا دریافت کئے پر سالِ ولادت نہ معلوم ہو سکا۔ اندازاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کہ حضرت سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے تو محمد علی شاہ کا عہد

عہد تھا۔ چار برس کی عمر تھی کہ آپ کے والد پنڈت بیجناتھ صاحب وفات کر گئے۔ اس صورت میں حضرت سرشار دامان مادری کے سایہ میں پرورش پاتے رہے۔ کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایامِ طفولیت میں طباعی اور ذہانت زبان کی طراری کے پردے میں اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ جس مکان میں رہتے تھے اس کے پڑوس میں اہل اسلام کی مخدرات رہتی تھیں۔ حضرت سرشار نے لڑکپن میں اردو زبان انہیں شریف خاتونوں سے سیکھی اور انھیں کے فیضان صحبت سے ان کو بیگمات کے طرزِ معاشرت سے بہت کچھ آگاہی کم سنی ہی کے زمانے میں ہوگئی تھی۔ معمولی آدمی پر یہ تربیت کچھ اثر نہیں کرتی۔ حضرت سرشار میں چونکہ ذہانت اور جدت کا خلقی مادہ موجود تھا لہٰذا ان کے حق میں ایسی پاکیزہ صحبت کیمیا ہوگئی۔ جب فسانہ آزاد لکھا تو لڑکپن کی تحقیقات کا یہ ذخیرہ دماغ میں موجود تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی دستور قدیمہ کے مطابق پائی۔ جب زمانہ نے سلطنت اودھ کا ورق الٹا اور انگریزی حکومت کی بنیاد پڑی تو انگریزی تعلیم کے لئے "کیننگ کالج" قائم ہوا۔ پنڈت رتن ناتھ بھی اس میں داخل ہوئے۔ مگر کوئی ڈگری نہ حاصل کر سکے۔

جب سن تمیز کو پہنچے تو کھیری ضلع اسکول میں مدرسی کا سلسلہ نکالا۔ اور حصولِ معاش کا ڈھنگ ڈالا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں نئے خیالات کا دریا طغیانی پر تھا۔ نظامِ معاشرت کے ہر صیغہ میں اصلاح کے مسائل در پیش تھے۔ اردو زبان پر بھی اختراع و ایجاد کا جادو چل رہا تھا ایسے رسالے اور اخبار جاری ہو رہے تھے۔ جن میں پرانے ایشیائی تکلفات کو خیرباد کہہ کر واقعات نفس الامری پر بحث ہوتی تھی۔ اِسی سلسلہ میں

ہماری قوم میں بھی ایک ماہوار رسالہ "مراسلہ کشمیر" کے نام سے شائع ہوتا تھا، جس میں اصلاح اور رفاہ قوم کے متعلق مضامین لکھے جاتے تھے۔ اسی زمانہ میں اودھ پنچ بھی اپنا رنگ جما رہا تھا۔ حضرت سرشار کے دل میں انشاپردازی کا خداداد مذاق موجود تھا۔ لہذا "مراسلہ کشمیر" اودھ پنچ وغیرہ میں لکھنا شروع کیا۔ گو کہ اس وقت حضرتِ سرشار کے کمال کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور اس کی شعاعیں دور تک نہ پھیلی تھیں۔ مگر اس وقت کے مضامین پڑھنے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں ایک خاص شوخی اور بے تکلفی ہے اور طرز تحریر میں عجب تازگی ہے جو دلوں میں مزہ دے جاتی ہے۔ ہاں اتنا کہنا لازمی ہے کہ حضرت سرشار کی اس زمانے کی نثر فسانہ عجائب کی نثر کا پہلو مارتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں رجب علی سرور مصنف "فسانہ عجائب" کا سکہ لکھنؤ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نثر اردو کے پیمبر سمجھے جاتے تھے۔ ہر مضمون نگار کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کی تقلید کرے۔ اس صورت میں اگر سرشار کی ابتدا کی نثر میں سرور کی کیفیت پائی جائے تو جائے تعجب نہیں۔ فارسی کا اس زمانہ میں ایسا رواج تھا کہ پہلے دو مضامین جو حضرت سرشار نے "مراسلہ کشمیر" میں اشاعت کے لئے بھیجے وہ فارسی زبان میں تھے۔ اسی زمانہ میں سررشتہ تعلیم کی جانب سے ایک اخبار نکلتا تھا۔ اس میں اکثر علمی اور اخلاقی مضامین کے ترجمے شائع ہوا کرتے تھے۔ اس رنگ میں بھی حضرت سرشار نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔ چنانچہ سررشتہ تعلیم کے مہتمم اعلیٰ نے اپنی سالانہ روئیداد محکمہ میں اس امر کا اعلان کیا کہ جیسا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ پنڈت رتن ناتھ کا ہوتا ہے، ایسا کسی دوسرے شخص کا صوبہ میں

Jammu & Kashmir University Library,
Accession No ...46633

نہیں ہوتا۔ غرض کہ حضرت سرشار کا مضمون نگاری کا شوق دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اودھ پنچ، مراسلۂ کشمیر، مراۃ الہند، ریاض الاخبار، وغیرہ آپ کے زور قلم سے فیضیاب ہوتے رہے۔

۱۸۷۶ء میں ایک علم الطبعی کی کتاب کا اردو میں انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اس میں آب و ہوا و برف وغیرہ کی ماہیت کا حال درج ہے۔ چونکہ اس کے ہر صفحے میں تحقیقات علمی کا نور سمایا ہوا تھا۔ لہذا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ ایسے ادق مضامین کا بیان جن کا نقشہ اتارنے کے لئے اردو میں پورے الفاظ بھی موجود نہیں نہایت عام فہم اور سلیس عبارت میں لکھا ہے

اسی سال تقدیر نے حضرت سرشار کی زندگی کے کارنامے میں ایسا ورق الٹا۔ جس سے کہ آپ کا کمال اہل ملک اور اہل قوم پر آئینہ ہو گیا۔ اور خود اس صاحب کمال کو قبول عام کی سرکار سے نکتہ سنجی اور زباندانی کی سند ملی، یعنی یہ وہ مبارک سال تھا جب کہ منشی نولکشور نے حضرت سرشار کو "اودھ اخبار" کی اڈیٹری کا قلمدان سپرد کیا۔ اس زمانہ میں "اودھ اخبار" کو جو عروج حاصل ہوا اس کا زمانہ شاہد ہے۔ حضرت سرشار نے وقائع نگاری میں اپنا رنگ جما لیا۔ پولٹیکل اور سوشل مضامین میں بھی وہ نکتے اور باریکیاں پیدا کیں کہ دلوں کو تسخیر کر لیا۔ لیکن ابھی حضرت سرشار کی شہرت کے تاج میں سب سے اعلیٰ نگینہ نہیں جڑا گیا تھا۔ یعنی فسانۂ آزاد کی ابھی تک بنیاد نہیں پڑی تھی۔

جس صورت میں ہم آج فسانۂ آزاد کو دیکھتے ہیں۔ اس طرح یہ شروع میں شایع نہیں ہوا تھا۔ مصنف نے اس کے آغاز کے وقت اسکی ابتدا و انتہا کا خیال نہ کیا تھا۔ اصل کیفیت فسانہ مذکور کی بنیاد پڑنے کی

٤.٤.٦٥

یوں ہے۔ کہ جب حضرت سرشار کھیری سے لکھنؤ آئے تو یہاں شب و روز یارانِ دقیقہ رس و صیح نفس کی صحبت میں گذرتی تھی، اس صحبت میں جہاں ایک سے ایک حاضر جواب و طرار موجود ہوتا تھا۔ وہاں منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ، و پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ جہاں ایسے ایسے زندہ دل موجود ہوں وہاں کی کیفیت کا کیا کہنا۔

ع۔ نظم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یار وہاں میں

افسوس کہ زمانے نے اس مجموعۂ صحبت کو پریشان کر دیا۔ اب منشی محمد سجاد حسین صاحب کا دم غنیمت ہے۔ اردو انشا پردازی کا نام لکھنؤ میں انہیں کی ذات سے زندہ ہے۔ ؎

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

اس صحبت میں ایک روز پنڈت تربھون ناتھ ہجر نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھئے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسیے تو وہ "ڈان کوئک زاٹ" ہے۔ اگر اردو میں اس طرز کا فسانہ لکھا جائے تو خوب ہے۔ حضرت سرشار کے دل پر اس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی۔ کہ اردو میں "ڈان کوئک زاٹ" کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ "اودھ اخبار" میں ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شایع ہونے لگے۔ یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج کے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی محرم پر ایک مضمون نکل گیا کبھی جہلم پر۔ کبھی عیش باغ کے میلے پر۔ اس وقت تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکل کر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اور حضرت سرشار

کا بھی شاید ہی منشا رہا ہو۔ مگر لوگوں کو یہ سلسلہ مضامین ایسا بھایا کہ اسکے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ مختلف مضامین کی لڑیوں کو گوندھ کر فسانہ کا سلسلہ نکالا۔ ایسے مضامین میں جن کا لگاؤ ایک دوسرے سے بہت ہی کم تھا، سلسلہ پیدا کرنا آسان کام نہ تھا اور اصل تو یہ ہے کہ کامل سلسلہ پیدا نہ ہو سکا۔ اگر سلسلہ ہے تو اتنا ہے کہ اس فسانے کے رستم داستاں میاں آزاد خانہ برباد ہر فن میں طاق اور ہر کمال میں مشتاق ہیں۔ جتنے علوم عقلی و نقلی ہیں ان میں ان کو دخل ہے۔ سپہ گری کے فن میں بھی برق ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔ حسن میں اگر یوسف ثانی کہئے تو بجا ہے۔ صبح ہوئی اور یہ بوئے گل کی طرح گھر سے نکلے۔ اور دنیا بھر کی سیر پر کمر باندھ لی۔ کبھی لکھنؤ کا محرم دیکھنے چلے آئے۔ کبھی عیش باغ کے میلے پہنچے۔ کبھی کسی نواب کی دربار داری کی۔ غرض کہ یہ جہانیاں جہاں گشت آدمی ہیں۔ ان کے لئے کسی خاص ارادے یا مشغلے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر صبح میزند چو شفق جوش خونِ ما موقوف بر بہار نہ باشد جنون ما

اس کوچہ گردی میں ایک روز ان کی نگاہ ایک ناظورۂ ملاکا قریب سے لڑ گئی۔ ادھر سے پیغام وصال ہوا۔ بعد ہزار ناز و نیاز اس پری پیکر نے جو کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون تھی اس شرط پر ان سے شادی کرنا منظور کی کہ یہ روم جائیں اور سلطان کی فوج میں شریک ہو کر روس کے خلاف لڑیں۔ حضرت آزاد بھی اپنی دھن کے پکے تھے سیدھے روم پہنچے اور وہاں سے سرخ رو ہو کر اپنی محبوبہ کے پاس آئے اور خوشی خوشی بیاہ رچایا۔ اصل قصہ "فسانۂ آزاد" اسی قدر ہے۔ مگر مصنف کے

زورِ قلم کا یہ عالم ہے کہ پچیس سو صفحے اس مختصر مطلب کے ادا کرنے میں صرف کئے اور داستان کی دلچسپی میں فرق نہ آیا۔ علاوہ ''ڈان کوئکزاٹ'' کے مختلف انگریزی افسانوں کے حالات اس میں درج ہیں۔ لیکن مصنف کے قلم میں وہ جادو ہے کہ ہر بیان کو اپنا کر لیا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ فلاں داستان ''فسانہ آزاد'' کی فلاں انگریزی ناول سے اخذ کی گئی ہے۔ مگر ثابت نہیں کر سکتے۔ حضرت سرشار کی یہ کیفیت تھی۔ کہ چار آدمیوں میں بیٹھے ہیں۔ باتیں کرتے جاتے ہیں اور وہی باتیں فسانے میں لکھتے جاتے ہیں۔ مگر اس انداز سے کہ عبارت کی شوخی اور مضامین کی تازگی میں سرِمو فرق نہیں آتا۔ واللہ کیا زبان پائی تھی جو اس زبان سے نکل گیا عالم کو بھایا اور تاثیر کا طلسم بن گیا۔ جس زمانے میں فسانہ ''اودھ اخبار'' میں نکل رہا تھا۔ حضرتِ سرشار کا ہندوستان بھر میں طوطی بول رہا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے آپ کے پاس خطوط آتے تھے۔ جن میں آپ کی اعلیٰ دماغی قابلیت اور زبان دانی کی داد دہی مدنظر ہوتی تھی۔ یہ خط معمولی لوگوں کے نہ ہوتے تھے بلکہ ایسے حضرات کے جن کی قابلیت و لیاقت ضرور قابلِ تحسین ہے۔ مثلاً ایک خط مولوی عبدالحلیم صاحب شررؔ کا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جناب پنڈت جی صاحب زاد فضائلکم۔

حضرت تسلیم۔ آپ نے فسانہ آزاد کیا لکھا ہے زبان اُردو کے حق میں مسیحائی کی ہے۔ باوجودیکہ وہ بیچاری آج کل کے زباندانوں سے ایسی ڈرتی ہے جیسے میاں خوجی کی قرولی سے میں۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ ہماری بیچاری پرانی عمدہ زبان کے ایک آپ تو معین نکلے۔ للہ الحمد....

اور تو ہم سے کیا ہو سکتا ہے صرف۔۔۔۔ قطع تاریخ آپ کے پاس بھیجتے ہیں خود ملاحظہ فرما کر قسطنطنیہ میں میاں آزاد کے ملاحظہ میں ضرور بھیج دیجئے گا تاکہ وہ خود تو دیکھیں۔ نہیں صاحب آپ کا ہیکو تکلیف فرمائیے جب چھپیگا وہ خود ہی دیکھ لیں گے۔

راقم اثیم و احقر محمد عبد الحلیم شرر لکھنوی

قطعہ تاریخ

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ — کن کن محاوروں کا کیا ہے نباہ واہ
دیکھیں جو شوخیاں ترے خامہ کی غور سے — بولے شفیق واہ، عدو بولے آہ آہ
کرتا شرر ہے مصرع تاریخ پیشکش
کیا لوں حال لکھی رتن ناتھ واہ واہ

مگر فلک پیر کی تفرقہ پردازی دیکھیے کہ اس اثنا میں اودھ پنچ جو کہ شروع میں حضرت سرشار کے زور قلم سے فیض یاب ہوتا رہا تھا، آپ کے خلاف ہو گیا۔ فسانہ آزاد پر جا و بیجا اعتراضات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ پھر تو اس ظرافت کے نہنگ بحر آشام نے بھی کروٹ لی اور ایسے اپنے دندان شکن جواب دئیے کہ معترضین کے منہ پھر گئے۔ اس فساد نے یہاں تک طول کھینچا کہ منشی سجاد حسین اور حضرت سرشار سے صاحب سلامت ترک ہو گئی، مگر چونکہ دونوں کا آئینہ دل زنگ کدورت سے صاف تھا۔ اور دونوں پرانے یار تھے لہذا پھر باہم صفائی ہو گئی اور اگلی سی محبت قائم ہو گئی۔ چنانچہ آخری مضمون حضرت سرشار کا جو کہ انہوں نے مرنے کے دن لکھا تھا اودھ پنچ ہی کے لئے لکھا گیا تھا اور اس میں شایع

ہوا۔ اس باہمی تنازع کا حال پڑھ کر عبرت حاصل ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ انشا پردازی کی آبروریزی ہوئی اور کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آج فسانہ آزاد مطبوع خلایق ہے۔ اس کے اچھوتے فقرے اور لطیفے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اعتراض کسی کو یاد بھی نہیں۔ بجز اس کے کہ اودھ پنچ کی پرانی جلدوں میں قلمبند ہیں مگر وہ بھی اب کیڑے چاٹے جاتے ہیں۔

غرض کہ قدردانوں کے نعرہائے تحسین اور معترضین کے شور وغل میں یہ فسانہ شگرف اودھ اخبار کے ضمیمہ کے طور پر من ابتدائے دسمبر ۱۸۷۸ء لغایتہ دسمبر ۱۸۷۹ء برابر شایع ہوتا رہا۔ بعد ازیں ۱۸۸۰ء میں کتاب کی شکل میں شایع کیا گیا۔ قدردانان سخن شوق کا دامن پھیلائے پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ شایع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ لفظوں کی نئی تراش، ترکیبوں کی خوبصورتی، کلام کی گرمی، مضامین کی شوخی، طرز تحریر کی نزاکت، جواب وسوال کی نوک جھونک، زبان کی پاکیزگی، محاورہ کی صفائی، روزمرہ کی لطافت، ظرافت کی گلکاری، تراشوں کی نئی پھبن، ایجادوں کی بانکپن نے لوگوں کو حضرت سرشار کا والہ وشیدا بنا لیا۔ اردو میں ایسے افسانے کا شایع ہونا بالکل ایک نئی بات تھی۔ اس موقع پر اس امر کا اعلان بھی لازمی ہے کہ محض قصہ سمجھ کر فسانہ آزاد کی وقعت کا اندازہ کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ اس فسانہ کی دلچسپی کا انحصار اس کی داستان کے مسلسل ہونے پر نہیں ہے۔ حضرت سرشار نے اس میں لکھنو کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنو کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اس شہر مرحوم کے باشندوں کا طرز معاشرت اس کی

گذشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں درد محبت پیدا کرتا ہے۔ ہاں بنگاہ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہاں کی عالی شان مگر شکستہ عمارتوں کے ٹوٹے ہوئے درودیوار، زمانے کے نشیب و فراز کی تصویریں ہیں۔

ہر کجا خشت کہن بینی دراین ویرانہ   ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

گو کہ یہاں کے شرفا فلک زدہ ہیں اور زمانے نے ان کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا ہے۔ مگر ان میں ابھی بوئے ریاست پائی جاتی ہے۔ وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں۔ جس کو وہ آئین شرافت سمجھتے ہیں اور ایک خاص تہذیب کے یادگار ہیں۔

اسلاف کے کچھ اثر ہیں باقی   اس راکھ میں کچھ شرر ہیں باقی
گو خوار ہوئے ہیں جو وہی ہے   مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

ان کی تقریر و گفتگو شائستگی و پاکیزگی کی معیار ہے۔ ان کی نشست و برخاست کا طریقہ سلسلہ و امتیاز کا دستور العمل ہے۔ ان لوگوں کو جنہوں نے نئی تہذیب میں نشو و نما پائی ہے۔ اور جو تہذیب قدیم کے مذاق سے بالکل ناآشنا ہیں پرانی روشوں میں سوائے عیوب کے کوئی جوہر نہ نظر آئے گا۔ مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس زوال کی حالت میں بھی لکھنؤ ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عبرتناک تصویر ہے۔ جس کا رنگ ابھی بالکل نہیں اڑ گیا ہے۔ باوجود ہزاروں عیوب کے یہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت میں اب بھی ایک لطافت ہے جو کہ بیرونجات کے رہنے والوں کو نصیب نہیں۔ زبان شستگی، طبیعت داری، علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب و سلیقہ، حسن تقریر تو گویا شرفائے لکھنؤ کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ سرشار نے جو کہ شاعر کا دماغ

اور مصور کی آنکھ اپنے ساتھ لایا تھا۔ فسانۂ آزاد میں اس تہذیب کا مرقع کھینچا ہے۔ مگر صرف اس تہذیب کا خوشنما پہلو ہی نہیں دکھایا ہے بلکہ اس کے وہ عیوب بھی جو اس کے جوہروں کو چھپائے ہوے ہیں اور جو ہر تہذیب کے زوال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ظرافت کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ خصوصاً محلات کے طرز معاشرت اور بول چال کا وہ رنگ دکھایا ہے کہ باید وشاید۔ بیگمات کی نستعلیق چال ڈھال اور شستہ و پاکیزہ تقریر کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نوخیز اور کمسن لڑکیوں کی شوخی اور طراری کا عالم دل پر بجلی گراتا ہے۔ ہر ایک بادۂ جوانی سے سرشار ہے۔ رگ رگ میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک بات سے ہزار رنگینیاں پیدا ہیں۔ قدم قدم پر ناز و انداز قربان ہوتے ہیں مگر ایسی حیا پرور کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھیں۔ پرانی جہاں دیدہ بڑھیوں کی محبت آمیز بدگمانی اپنے رنگ میں لطف دیجاتی ہے۔ ان کی زبان سے جو نصیحت آمیز کلمے نکلتے ہیں وہ ادب اور سلیقے سے معمور ہوتے ہیں۔ مامائیں، مغلانیاں ہیں کہ ہوا سے لڑتی ہیں، ضلع جگت میں طاق ہیں۔ زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے۔ رستے چلتے لوگوں پر پھبتیاں کہتی ہیں۔ نواب صاحب اپنے رنگ میں مست ہیں۔ عجب انداز سے شام کو چوک کی سیر کو نکلتے ہیں۔ گلے میں منت کے طوق پڑے ہیں، بازو میں اماں ضامن کا روپیہ بندھا ہے۔ تین کمر تو پی کا چست انگرکھا زیب بدن ہے۔ کمر کا عدم و جود برابر ہے۔ چوڑی دار پائجامہ پنڈلیوں سے چپکا ہوا ہے۔ نکے دار ٹوپی آئینہ سے سر پر رکھی ہوئی ہے، پانچ چار افیونی مصاحب ساتھ ہیں۔ خدمتگار کے ہاتھ میں خاصدان ہے اور بغل میں بٹیروں کی کابک دبی ہوئی

ہے۔ غرض کہ اسی صورت پر اس نگار بند معانی نے مختلف تصویریں مانی و بہزاد کے قلم سے کھینچی ہیں اور بیچ بیچ میں ظرافت نے ایسی گلکاری کی ہے کہ جس طرح اتنی بڑی داستان لکھنے میں مصنف کا قلم نہیں تھکا ویسے ہی پڑھنے والا نہیں تھکتا۔ جہاں خوجی کی قرولی میان سے نکلی کہ پڑھنے والوں کی باچھیں کھل گئیں۔ بہروپئے اور بُوا زعفران کے معرکے ہنستے ہنستے لٹا دیتے ہیں۔

اردو میں حضرت سرشار اس طرز نو کے موجد ہیں اور ان کا فخر کہ

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری   اول بہ شگون کرد طوافِ حرم را

نہایت درست ہے۔ پرانے زمانے کے فسانوں میں جن میں "فسانۂ عجائب" پایۂ عالی رکھتا ہے، زندگی کے کل مرحلے روحانی قوتوں کی مدد سے طے کئے جاتے ہیں۔ ان میں انسانی جذبات اور دانش و بینش کی وہ تصویریں نہیں پائی جاتیں جن سے کہ فسانۂ آزاد کی رونق و وقعت ہے۔ پرانے افسانوں میں قریب قریب ہر داستان اس طرز پر ہوتی ہے۔ کہ طوطا بولا "اے شاہزادۂ والا تبار فلاں ملک میں جو کہ یہاں سے اسّی کروڑ کوس کے فاصلے پر ہے ایک شہزادی ہے جس کا ساحُسن نہ دیکھا نہ سنا۔ ضیائے رُخ کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں رات ہوتی ہی نہیں۔" یہ سننا تھا کہ شہزادہ صاحب کو اس سے شادی کرنے کا شوق چرّایا۔ اب اندھادھند نکل کھڑے ہوئے کہیں صحرائے طلسم میں اسیر ہوئے کہیں دیوؤں سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ کہیں رات کو پریاں فرش خواب سے اٹھا لے گئیں۔ کہیں حضرت خضر سے ملاقات ہو گئی غرض کہ اسی انداز پر کل داستان کی داستان پوچ و یادر ہوا خیالات کا ذخیرہ ہوا کرتی ہے فسانۂ آزاد کے بعد یہ طرز بالکل متروک ہو گیا۔ اسکے

انداز تحریر نے ایک نیا راستہ پیدا کر دیا۔ جس نے کہ پرانے وضع کی فسانہ نگاری کی وقعت کھو دی۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "فسانۂ آزاد" میں باوجود اس قدر خوبیوں کے اکثر عیوب بھی موجود ہیں۔ جو کہ قدر دانوں کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے فسانۂ مذکور کی اشاعت کے وقت معترضین کو حرف گیری کا موقع ملا۔ اولاً جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے فسانۂ آزاد میں وہ سلسلہ و ترتیب یا انتظام نہیں ہے جو کہ عموماً ناول کی شان میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً ثریا بیگم کی داستان بجائے خود ایک چھوٹا سا فسانہ ہے جس کا تعلق کل قصہ سے ایسا کامل نہیں ہے، جیسا کہ لازمی ہے۔ اسی طرح اکثر مقامات پر گلہائے مضامین کے انبار لگے ہوئے ہیں جن سے کامل تماشہ کا دماغ معطر ہے۔ لیکن ان پھولوں میں کوئی ایسا رشتہ نہیں جن سے ایک ہار گندھ جائے۔ علاوہ بریں میاں آزاد کا چال چلن متضاد صفات سے مملو ہے شروع میں یہ شخص ایک آوارہ مزاج اور رند باش آدمی تھا۔ پنج عیب شرعی اس میں موجود تھے۔ لیکن یکایک ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ تہذیب و شائستگی رگ رگ میں سما گئی ایسے وارستہ مزاج شخص کا بلا وجہ اس قدر مہذب ہو جانا خلاف قانون قدرت ہے۔ حسن آرا کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی مسلمانوں میں ابھی دو صدی تک ایسی آزادی پسند عورت نہیں پیدا ہو سکتی نیز یہ عقدہ نہیں کھلتا کہ حسن آرا کے خیالات کیونکر اس درجہ عالی ہو گئے۔ ظاہر ہے خیالات پر صحبت کا اثر پڑتا ہے یا تعلیم کا، حسن آرا کی صحبت ہمیشہ پرانے خیالات کی بیگمات سے رہی۔ اور تعلیم فارسی پائی۔ اس صورت میں مغربی تہذیب کا رنگ اس خاتون کے خیالات پر کیوں کر چڑھا۔ غرض کہ

حسن آرا کی چال ڈھال کا انداز جیسا کہ اس فسانہ میں دکھایا گیا ہے خلاف فطرت انسانی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ یہ باتیں ایسی ضروری نہیں ہیں کہ جن سے فسانۂ آزاد ناول کے لقب کا مستحق نہ سمجھا جاوے۔ خوجی جو کہ فسانہ کی جان ہے۔ ہر مقام پر اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جیسا کہ آزاد کو ہر وقت حسن آرا کا خیال رہتا ہے، ویسا ہی اس کو افیون سے عشق ہے۔ روم ہو کہ ہندوستان، قرولی ہر وقت میان سے باہر ہے۔ کتنی مرمت کیوں نہ ہو مگر اس کے تیور میلے نہیں ہوتے کیسی ہی مصیبت کیوں نہ ہو لیکن زندہ دلی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ آزاد کتنا ہی ستائیں مگر وہ ان پر جان نثار کرنے کو تیار رہے۔ خوجی کی چال ڈھال شروع سے آخر تک ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمایوں فر۔ سپہر آرا۔ بڑی بیگم۔ اللہ رکھی وغیرہ فطرت انسانی کی سچی تصویریں ہیں۔ اس کے علاوہ فسانۂ آزاد میں ناول کے اور قرائن بھی موجود ہیں۔ جذبات دلی، کیفیت قلبی، شادی وغم، عشق و شجاعت، جلوہ ہائے قدرت صبح و شام، باغ، سیر دریا وغیرہ۔ جس کیفیت کو بیان کیا ہے۔ تصویر کھینچ دی ہے۔

فسانۂ آزاد میں یہ بھی ایک خفیف سا عیب ہے کہ مصنف سے اکثر مقامات پر تناسب واقعات نہ نبھ سکا۔ مثلاً ایک روز کا ذکر یوں لکھا ہے۔ کہ حسن آرا نے میاں آزاد کے علم وفضل کا امتحان کیا۔ اور فرمایش کی کہ ایک بوڑھے کی شادی ہوئی ہے، اس شادی کی تاریخ کہو۔ میاں آزاد نے کہا "پیر نابالغ" سے ۱۲۹۶ ہجری تاریخ نکلتی ہے۔ روم کی لڑائی ۱۲۹۶ ہجری کے دو تین برس پہلے ہوئی۔ مگر میاں آزاد اس تاریخ

بجانے کے بعد روم کی لڑائی میں شریک ہونے کے لئے گئے۔ لہذا تاریخ غلط ہو گئی اور واقعات میں تناسب نہ قائم رہ سکا۔ اسی طرح ایک مقام پر حضرت سرشار خدا جانے کس ترنگ میں لکھ گئے کہ "بام پر بیش بہا شال کا خیمہ نصب ہوا"۔ اب معترض سوال کرتا ہے کہ "میخ کہاں ٹھونکی گئی، چھت تو اس کام کی ہوتی نہیں"۔ اس موقع پر ہم کو بھی لاجواب ہونا پڑتا ہے۔ ایک مقام پر مصر کا اناچی خوجی سے کہتا ہے۔ کہ "کرسی کے احمق ہو"۔ یہ خاص لکھنو کا محاورہ ہے، مصر کے اناچی کو اس کی کیا خبر۔ اس قسم کی لغزشیں فسانۂ آزاد میں پائی جاتی ہیں۔ گو کہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ مگر چونکہ یہ فسانہ نہایت عجلت اور لاپروائی کے ساتھ لکھا گیا تھا لہذا ایسی لغزشیں قابل معافی ہیں۔

اکثر محاورے بھی فسانۂ آزاد میں ایسے ملیں گے جن کو لکھنو کے اہل زبان دارالضرب شاہی کا سکہ نہ کہیں گے۔ اس قسم کی حرف گیری زیادہ تر "اودھ پنچ" کے معترضین نے کی ہے۔ اس موقع پر ہم کو افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عموماً "اودھ پنچ" کے معترضین کی تحریریں انصاف پسندی کے جوہر سے خالی ہیں۔ ایک ایک جملہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ دلی تعصب زبان قلم سے رنگ سخن بن کر پھوٹ نکلا ہے۔ مثلاً ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "فسانہ کا ہے کو دیوانی ہانڈی یا صدقے کا ست بجا ہے مصنف کا دماغ بالکل اس گندی گڑھیا سے مشابہ ہے جو کہ کوڑے کرکٹ اور لونڈوں کے ڈھیلوں کی بدولت چودھویں رات کو بھی کسی ستارے یا چاند کا عکس کسی جگہ نہ دیکھ سکے گا۔" اودھ پنچ۔ مطبوعہ ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۸۲ء

ایسی تحریر کو نہ کوئی منصفانہ تنقید کہے گا نہ ظرافت۔ اسی طرح اکثر حضرات نے کاتب کی غلطیوں کا خاکہ اڑایا ہے۔ مثلاً "چھوٹی موٹی" کے بدلے

موٹی چھوٹی' یا 'چوگوشیہ ٹوپی'' کے بدلے چوگوشہ ٹوپی چھپ گیا۔ تو یہ غلطیاں بھی مصنف ''فسانۂ آزاد'' کے سر منڈھی گئیں (دیکھو اودھ پنچ مطبوعہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۰ء) اس میں شک نہیں کہ اودھ پنچ کے اکثر نامہ نگار خود اعلیٰ درجے کے لکھنے والے تھے۔ اور بذلہ سنجی ولطیفہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے وہ بھی اس نئے طرز تحریر کو رواج دے رہے تھے جس کو رتن ناتھ نے فسانہ آزاد میں عرش پر پہنچا دیا۔ مگر فسانۂ آزاد سے ان حضرات کو خاص تعصب ہو گیا تھا۔ اس تعصب کی وجہ بیان کرنا گویا پرانے زخم کا ہرا کرنا ہے علاوہ دوسری وجہوں کے ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ جس وقت سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے تو یہ اخبار اودھ پنچ کے ظریفوں کا تختۂ مشق ہو رہا تھا۔ اس حالت میں فسانۂ آزاد سے مخالفت کچھ تعجب نہیں۔ کیونکہ اودھ اخبار کی جان یہ فسانہ تھا۔ با ایں ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے اکثر محاورے فسانہ میں ضرور قابل اعتراض ہیں۔ افسوس اس قدر ہے کہ جس پیرایہ میں اودھ پنچ کے معترضین نے ان لغزشوں کا خاکہ اڑایا ہے وہ مذاق سلیم کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اگر بے تعصبی اور ہمدردی کے ساتھ یہی اعتراض کئے جاتے تو ان کی وقعت بھی بڑھ جاتی اور کوئی نقصان یا ضرر بھی واقع نہ ہوتا۔ اب اعتراض ملاحظہ ہوں حضرت سرشار فسانۂ آزاد میں لکھتے ہیں ''طبیعت بے مزہ سے ذری جاتے کیا'' (فسانۂ آزاد ضمیمہ اودھ اخبار صفحہ ۵ مطبوعہ ۱۳ جولائی ۱۸۸۰ء) اعتراض ہے۔ ''جانے کیا ہوا'' لکھنؤ کی بول چال نہیں۔ اور بے مزہ کھانا ہوتا ہے طبیعت کو بدمزہ کہتے ہیں۔ اسی نمبر کے صفحہ ۷ پر ''دائیں طرف'' لکھا ہے اصل محاورہ ہے ''داہنے طرف'' ایک مقام پر تحریر ہے کہ ''کئی بار پائی

سر دے مارا" (فسانۂ آزاد ضمیمہ اودھ اخبار صفحہ ۳۶ مطبوعہ اگست ۱۸۸۰ء)
"پائی" لفظ غلط ہے "پئی" درست ہے۔ "غم مفارقت میں دل پھٹا جاتا تھا۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا" (فسانۂ آزاد ضمیمہ اودھ اخبار صفحہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۸۸۰ء)
اس جگہ پر محاورہ بالکل غلط ہے "دل پھٹ جانا" قطع امید ہو جانے یا بیزار ہونے کی جگہ آتا ہے نہ کہ عاشق و معشوق سے دل پھٹ جائے۔ "وہ تو عین دوپہر کے وقت جب چیل انڈے پر انڈا چھوڑتی ہے۔ الخ" (فسانۂ آزاد صفحہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۸۸۰ء) یہ محاورہ بھی غلط ہے۔ اصل محاورہ صرف اتنا ہے کہ "ایسی گرمی پڑتی ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے"۔ مراد یہ کہ چیل کسی حالت میں اپنا انڈا نہیں چھوڑتی مگر ایسی گرمی پڑی کہ وہ بھی اپنے انڈوں سے الگ ہو جاتی ہے۔ یعنی سینا ترک کر دیتی ہے۔ اس محاورہ سے صرف گرمی کا مبالغہ مد نظر رہتا ہے۔ حضرت سرشار شاید انڈا چھوڑنے سے انڈا دینا مراد سمجھے۔ اس قسم کی لغزشیں دیگر مقامات پر بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر ایسی لغزشوں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرتِ سرشار زبان داں نہ تھے سراسر ناانصافی ہے۔ ایسی لغزشوں کی ہستی اتنی بڑی کتاب میں ایسی ہے جیسے کہ کسی قلزم ذخار میں خس و خاشاک۔ اور کون ایسا مصنف ہے کہ جس کی تصنیفات بالکل عیب سے پاک ہیں۔ دیکھو آتش مغفور کا مصرع ہے۔ ع

"تماشہ قتل گہ کا ہے مطالع میرے دیوان کا"

"مطالع" محض غلط ہے' اصل لفظ ہے مطالعہ۔ ایک غزل کا مصرع ہے۔ ع

"درد درماں سے المضاف ہوا"

اصل لفظ ہے "المضاعف" آتش نے المضاف غلط نظم کیا ہے۔ ایک اور

مصرع یاد آگیا۔

ع "کوئی نہیں چھوڑتا حلوہ بے دود کو"

حلوہ بے دود بھی غلط ترکیب ہے۔ "حلوائے بے دود" درست ہے۔ ایک اور مصرع یاد آگیا۔ ع

دل بیتاب کو پہلو میں اک گرگ بغل پایا

اعتراض ہے کہ "گرگ بغل" غلط ہے۔ "بغلی گھونسا" محاورہ ہے۔ اب ان لغزشوں کو دیکھکر اگر کوئی شخص آتش کی زباندانی اور استادی پر حرف رکھے تو یہ محض حماقت ہی نہیں، بلکہ بے ادبی ہے۔ فسانہ آزاد میں اکثر بھرتی کے مضامین ہیں۔ مثلاً نہیا سنی کے وعظ، یا اخلاقی پندونصایح کے متعلق تقریریں خانہ پری کے لئے درج ہیں۔ خلاق عالم نے حضرت سرشار کو کسی سنجیدہ کام انجام دینے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا تھا۔ وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے دنیا میں آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں پندو نصائح کا دفتر کھولا ہے فسانہ کا رنگ پھیکا ہوگیا ہے۔

مگر باوجود ان عیوب کے جن کا ذکر سلسلہ وار کیا گیا ہے فسانہ آزاد بحیثیت مجموعی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ اس کے جوہر اس کے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ میرے دوستو! تحقیقات جدید سے ثابت ہوا ہے کہ آفتاب میں بھی سیاہ داغ موجود ہیں۔ لیکن جس طرح یہ داغ آفتاب کی ضیا نہیں گھٹا سکتے۔ اسی طرح حضرت سرشار کی طبع نورانی باوجود اکثر خفیف عیوب کے قدردانان سخن کی آنکھوں کو ہمیشہ نور بخشتی رہیگی۔ اور جو لوگ تعصب سے شپرہ چشم ہو رہے ہیں وہ چاہے کچھ سمجھیں۔

جہاں تک محض انشاپردازی کا تعلق ہے اس امر سے کوئی انکار

نہیں ہو سکتا کہ حضرت سرشار نے طرز قدیم کو نسخ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ رجب علی سرور کے فسانہ عجائب کی زبان نثر اردو کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن سرشار کا طرز زیادہ دلکش ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ فسانہ آزاد کے شایع ہوتے ہی فسانۂ عجائب کتب قدیم کے عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل ہو گیا یعنی جس کا وجود اب صرف اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ زمانہ قدیم میں نثر اردو کا کیا رنگ تھا۔ دیکھو دونوں مصنفوں کے طرز تحریر کے نمونے پیش نظر ہیں۔ دونوں کے آغاز داستان کا نمونہ دیکھو۔

سرور۔ گرہ کشایان سلسلہ سخن، تازہ کنندگان فسانہ کہن، یعنی محرران رنگین و مورخان جادو تقریر نے اشہب جہندہ قلم کو میدان وسیع بیان میں باکرشمہ سحر ساز و لطیفہائے حیرت پرداز گرم عنان اور جولان یوں کیا ہے، کہ سرزمین ختن میں ایک شہر تھا مینو سواد بہشت نژاد پسند خاطر محبوبان جہاں، قابل بود و باش خوبان۔ الخ۔

سرشار۔ سحر کاذب کے وقت مرغ بے ہنگام نے گربہ مسکین کی آہٹ جو پائی تو گھبرا کر گڑاؤں کوں کی بانگ لگائی۔ ہمارے حبیب لبیب دقیقہ رس صبح نفس جو سر شام سے لمبی تانے میٹھی نیند سو رہے تھے، یہ آواز خوش آئند سنتے ہی کلبلا کر اٹھ بیٹھے۔ ادھر آنکھ کھلی اور باچھیں کھل گئیں۔

دونوں کے انداز تحریر دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور کی نثر تصنع کے بوجھ سے گراں بار ہے۔ سرشار کا طرز شوخی اور بے تکلفی سے معمور ہے۔ قدرتی جوش اور صفائی بیان مل کر عجب عالم دکھاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نور کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ برخلاف اس کے سرور کی

نثر میں فرضی لطافت اور خیالی رنگینی کا دخل زیادہ ہے۔ سرور مضامین خیالیہ کی ہوائیں اڑتے ہیں۔ سرشار نے مضامین حالیہ کی تصویر کھینچی ہے اور ایسا ہونا جائے تعجب نہیں۔ رجب علی سرور کے زمانے میں فارسی کا رواج بہت تھا۔ یہانتک کہ خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ لہذا اگر اس کے طرز تحریر میں فارسی کا رنگ چوکھا ہے تو حیرت نہیں۔ بہر حال جو کچھ اس نے کیا وہ اس کے لئے باعث فخر ہے وہ بھی زبان پر قدرت کاملہ رکھتا تھا اور اپنے رنگ کا آپ موجد تھا۔ مگر حضرت سرشار کے سامنے بھی جو مرحلہ درپیش تھا اس کا طے کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہ تھا۔ یہ یاد رہے کہ وہی شخص ایجاد کا بانی ہو سکتا ہے جو کہ دلوں کی نبض پہچانے۔ ایسی اصلاحیں تجویز کرے جن کے اختیار کرنے کے لئے زمانہ تیار ہو۔ حضرت سرشار میں وہ دماغی جوہر موجود تھے۔ جن سے ایسی قابلیت پیدا ہو سکتی ہے اس انشا پردازی کی خدا نے ایک نئی دنیا پیدا کر دی، وہ روش نکالی جو مطبوع خلائق ہوئی۔ اس وقت جتنے ناول اردو زبان میں موجود ہیں۔ سب فسانہ آزاد کے بعد لکھے گئے ہیں اور سب میں حضرت سرشار کی طبع نوزائی کا عکس نظر آتا ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

وہ ایک آفتاب عالمتاب ہے یہ ذرات خاکی اس سے کسب نور کرتے ہیں۔ حضرت سرشار کی پوری وقعت کا اندازہ حضرت حالی کی حالت پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا تھا جو کہ سرشار نے اردو نثر کے ساتھ کیا۔ مگر چونکہ دل و دماغ اس کار عظیم کے انجام دینے کے لئے موزوں نہ تھا۔ لہذا ناکامیاب رہے

حضرت حالی نے اردو شاعری کے آئینہ پر انگریزی خیالات کی تصویر اتارنی چاہی۔ مگر چونکہ باریک بینی کا قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا لہٰذا تصویر کا ہر ایک جگہ سے چہرہ بگاڑ دیا۔ برخلاف اس کے حضرت سرشار نے اردو کی عروس زیبا شمائل کو انگریزی زیور پہنایا۔ مگر کسی مقام پر بے عنوانی کا سایہ نہ پڑنے دیا طلبائے مضامین کے قدرداں جانتے ہیں کہ نثر اردو کے باغ نے اس چمن بند کی رنگ آمیزیوں سے جو رونق پکڑی اس کی ثنا و صفت حیطۂ تحریر سے باہر ہے۔ ایک جانب تو پرانے تختے اور شاخیں کاٹ چھانٹ کر چمن کو از نو آراستہ کیا، نئی روشیں نکالیں۔ دوسری طرف نثر انگریزی کے گلشن سے چند ایسی قلمیں لایا جو ہندوستان کی آب و ہوا میں نشو و نما پکڑتی ہیں۔ اور ان کے پیوند اپنے چمن کے پودوں میں لگائے جن سے ایسے خوشنما پھول پیدا ہوئے کہ لوگ رجب علی کے لگائے ہوئے باغ کو بھول گئے۔ حضرت حالی نے بھی زمین شعر میں جو پرانا چمن لگا تھا اسکی درستی کرنی چاہی، مگر بجائے اس کے کہ برگ خزاں رسیدہ یا مرجھائے ہوئے پھول باغ کی روشوں سے ہٹائیں، سارا چمن اجاڑ ڈالا۔ اور بلحاظ موافقت آب و ہوا چند ٹہنیاں نظم انگریزی کے باغ سے کاٹ کر اس سرزمین میں لگا دیں۔ ان ٹہنیوں نے جڑ نہ پکڑی اور چند روز میں مرجھا کر رہ گئیں۔ اس انوکھے باغباں نے اپنی محنت کو بھی ڈبو دیا۔ اور پرانے باغ کی رونق کو بھی کھو دیا۔ مراد اس کہنے سے یہ ہے کہ پرانی روش کا ترک کرنا اور نئی وضع کا فروغ دینا بڑی طباعی اور عالی دماغی کا کام ہے آج کل اکثر اصحاب نئے خیالات کی تلقین کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی جملوں کی ترکیبیں اردو نثر میں الفاظ کو توڑ مروڑ کر کسی صورت سے داخل کی

جائیں اور ہربرٹ اسپنسر اور اگسٹ کانٹ کی فلسفیانہ تحقیقات کے نتائج موقع بے موقع بولی لنگڑی عبارت میں لکھ دئیے جائیں۔ چاہے پڑھنے والا سمجھے یا نہ سمجھے۔ یہ حضرت سرشار ہی کو فخر حاصل ہے کہ پرانے شیشوں میں اچھوتی ترکیبوں اور نئے خیالات کی بادۂ فرحت انگیز اس خوبصورتی سے بھری کہ پرانے اور نئے رنگ کی طبیعتوں کو یکساں کیفیت حاصل ہوئی۔

حضرت سرشار صرف فسانہ نگاری کے موجد ہی نہیں بلکہ اُردو کے سب فسانہ نگاروں میں ان کا پایہ عالی تر ہے۔ آج کس کا منہ ہے کہ دو صفحے ان کے رنگ میں لکھ سکے۔ ہندوستان میں آج جس قدر ناول نویس موجود ہیں شاید بارش کے موسم میں اس قدر حشرات الارض بھی نہ پائے جاتے ہوں گے۔ لیکن سرشار میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

جو باتیں یہ لوگ نہایت غور و فکر کے بعد پیدا کرتے ہیں۔ وہ ان کے لئے پیش پا افتادہ تھیں۔ اگر ان کے صفحوں کے صفحوں میں کہیں ایک آدھ فقرہ شوخ ہے تو وہ راکھ کی ڈھیر میں چنگاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کو دیکھو کہ ہزاروں صفحے لکھ ڈالے مگر پھر بھی کلام کی گرمی میں فرق نہیں آیا۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ کبھی اس شخص نے اپنے لکھے ہوئے مسودہ کی نظر ثانی نہیں کی۔ جس زمانے میں "فسانہ آزاد" اودھ اخبار میں شایع ہو رہا تھا۔ یہ لوگوں کے چشم دید واقعے ہیں۔ کہ اخبار شایع ہونے کو ہے اور کاتب پنڈت جی کو ڈھونڈھ رہا ہے کہ فسانہ کا مقررہ حصہ لکھ دیں، تاکہ اس روز نکل جائے۔ پنڈت جی آئے اور نہایت بے تکلفی سے چار

صفحے کھینچ کر پھینک دیئے اور کہا کہ آج کے پرچے میں بھیج دو۔ دیکھنے والے سمجھے کہ عجلت میں دیکھا گیا۔ پھر نگاہ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موتی پروئے ہیں گو کہ ہم کو حضرت سرشار کے ساتھ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا۔ مگر چونکہ اہل اسلام کے ایک خاص فرقے میں آپ کی شہرت بہت ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے طرز تحریر کا مقابلہ کیا جائے۔ انشا پردازی کے میدان میں سرشار، شرر سے کوسوں آگے ہیں۔ شرر کی عبارت سلیس و پاکیزہ ضرور ہوتی ہے مگر جدت سے خالی وہ بات کہاں کہ ہر حرف اپنے دامن میں رنگین ادائی کے پھول لئے ہوئے ہے۔ ان کی نثر ہر مقام پر نان بے نمک و شیر بے شکر ہے۔ ذیل کے اقتباس تمثیلاً درج ہیں۔

شرر۔ موجودہ زمانے اور مغربی تہذیب نے پنکچولٹی (پابندی وقت) کا سبق ایک حد تک سب ہی کو دیدیا۔ مگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہمارے مشرقی دلرباؤں اور ایشائی معشوقوں نے۔ وہ آج بھی ویسے ہی وعدہ فراموش ہیں جیسے سو دو سو برس پہلے تھے ...... عنفوان شباب کی خود پرستی انہیں اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ اسیر زلف گرہ گیر کے نالۂ شبگیر پر جھوٹوں بھی ترس کھائیں ...... مگر عاقبت اندیش عاشق ایک فلک دوز آہ کے ساتھ کہتا ہے۔ "کیا مضائقہ؟ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز۔" اور پہلے سے زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ پہلے سے زیادہ عشق بازی پر آمادہ ہوتا ہے۔ (دلگداز نمبر ۱۔ جلد ۷ مطبوعہ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء)

سرشار۔ مجنوں سے کسی ساربان نے کہا۔ کہ میاں تم دشت

نوردی کیوں کرتے ہو، لیلیٰ تمہارے ہتھے چڑھے۔

ای خیالست و محالست و جنوں

مجنوں نے ہنس کر کہا، تو اس پھیر میں نہ پڑ، تجھے معشوقوں کے عشوے اور غمزے سے کیا سروکار۔ تو شتر غمزے کا عادی۔ جا اپنے اونٹ چرا۔

در دلم عشق ز لیلیٰ کافیست　　خواہش وصل ز نا انصافیست

(دبدبۂ آصفی)

مضامین کے راستہ میں شرر کا راستہ بالکل الگ ہے۔ شرر تاریخی ناول لکھتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جب انہوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو اپنی قوت تحریر اور طباعی کا کافی طور پر اندازہ نہ کر لیا۔ اولاً تاریخی فسانہ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو کہ تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو۔ ثانیاً یہ کہ شاعر کا دماغ اپنے ساتھ لایا ہو۔ یعنی جس زمانے کا ناول لکھے۔ اس زمانہ کے طرز معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دے۔ انگریزی زبان میں جن فسانہ نگاروں نے اس قسم کے فسانے لکھے ان کی رگ رگ تاریخ ماضیہ کے عشق سے معمور تھی۔ وہ تاریخ کے لئے پیدا ہوئے تھے، اور تاریخ ان کے لئے۔ حضرت شرر ایسے واقعات قدیم کے نسبت ناول لکھتے ہیں جن کا تعلق تاریخ یورپ سے ہے لیکن یورپ کی کسی زبان میں دستگاہ عالی نہیں رکھتے۔ صرف ترجموں سے اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ اس حالت میں ان کا تاریخی علم تکمیل نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ قدیم زمانے کی سوسائٹی کے رمز و کنایہ کافی طور سے سمجھ سکتے ہیں۔ علاوہ بریں قلم میں بھی وہ جادو نہیں جو زمانہ دیرینہ کے مردہ قالبوں میں جان ڈال دے۔ یہی وجہ ہے کہ

ان کے فسانے رو کھے پھیکے ہیں۔ ان میں صرف تاریخی واقعات درج ہیں۔ مگر جس زمانہ کا وہ اشارہ کرتے ہیں اس زمانے کے طرز معاشرت کا رنگ نہیں کھلتا۔ شرر کے ناولوں کے سپاہی انگریزی فوج کے سپاہی ہیں جن پر صرف عرب کا لبادہ لاد دیا گیا ہے۔ شرر کے مقابلے میں سرشار کی فسانہ نگاری کا دائرہ ضرور محدود ہے۔ وہ صرف لکھنؤ کی سوسائٹی کا مرقع نگار ہے۔ لیکن وہ اس سوسائٹی کے رگ و ریشے سے واقف ہے۔ اس کا ہر نیک و بد پہلو اس کی نظروں میں کھنچا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس حالت کو بیان کرتا ہے اس کا سماں بندھ جاتا ہے، وہی کیفیت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، وہی آوازیں کانوں میں آنے لگتی ہیں۔ اس کے فسانے کی مخلوق جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ہم اس کے فسانہ پڑھتے ہوئے اس کو بھول جاتے ہیں۔ اور جو کیفیت وہ بیان کرتا ہے اس میں ہمہ تن محو ہو جاتے ہیں اور واقعی فسانہ نگار کے کمال کا معیار بھی یہی ہے۔ برخلاف اس کے شرر کے فسانوں کی مخلوق یہ دلچسپی نہیں پیدا کرتی۔ اگر وہ بولتے ہیں تو مصنف کی آواز سے اور دیکھتے ہیں تو اس کی آنکھ سے۔ مکالمہ میں یہ تمیز نہیں ہوتی کہ آدمی بول رہا ہے کہ فونوگراف سے آواز نکل رہی ہے دیکھو خوجی اور مہاراج بلی کا ذکر لوگوں میں اس طرح ہوتا ہے، جیسے اصل آدمیوں کا۔ مگر شرر کی طبع فکر نے ایک مخلوق بھی ایسی نہ پیدا کی۔ غرضکہ فسانہ نگار وہی کیفیت پیدا کر سکتا ہے جس سے اس کو کما حقہٗ آگاہی حاصل ہو۔ سرشار جب خود اس اصول سے ہٹے ہیں تو دھوکا کھایا ہے۔ مثلاً کامنی میں انہوں نے ہندوؤں کے طرز معاشرت کا رنگ دکھانا چاہا ہے مگر چونکہ وہ خود اس رنگ سے نا آشنا تھے، لہذا جس جگہ انھوں نے

ہندو عورتوں کی چال ڈھال اور گفتگو کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، ان کا قلم چلتے چلتے رک گیا ہے مجبور ہو کر اس مرقع میں بھی اسلامی تہذیب کا رنگ بھرنا پڑا ہے۔ ہندو طرزِ معاشرت کی تشریح میں درپردہ اسلامی سوسائٹی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یا یوں کہو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خاتونوں کو ہندوانہ لباس پہنا کر تصویر کھینچی ہے۔ یہ نقص جو سرشار کے ایک ناول میں ہے، شرر کے کل ناولوں میں زیادتی کے ساتھ موجود ہے۔ آخر یہ کہنا نامناسب نہیں کہ اگر نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو شرر اور سرشار کا کوئی مقابلہ نہیں۔ گو کہ شرر کی شہرت سرشار سے کسی حالت میں کم نہیں۔ لیکن یہ امر اس حکیمانہ اصول کی تائید کرتا ہے کہ محض شہرت کو اصلی لیاقت کا معیار نہ سمجھنا چاہئے۔

ہاں اگر کوئی زمانۂ موجودہ کا مصنف حضرتِ سرشار کا ہم پایہ ہے تو وہ محمد حسین آزاد ہے۔ اس کو بھی اردو زبان پر قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔ اس کی مشہور و معروف کتاب "آبِ حیات" اس کا نام قیامت تک زندہ رکھیگی۔ سرشار کی طرح وہ بھی ایک طرزِ نو کا موجد ہے۔ دونوں مصنفوں نے اپنے اپنے رنگ میں معجزہ دکھایا ہے۔ دونوں کا دماغ فیضانِ قدرت سے شاداب ہے لیکن اندازِ تحریر جداگانہ ہے۔ سرشار کا طرزِ تحریر شوخ مضامین کے لئے موزوں ہے۔ آزاد کی نثر سنجیدہ مسائل کی بحث کا بار آسانی سے اٹھا سکتی ہے۔ سرشار کا رنگ ظریفانہ ہے اور ایک ایک لفظ پر شوخی اور رنگینی قربان ہے۔ آزاد کی عبارت سلیس و فلسفیانہ ہے اور عمیق و رومانی مضامین سے دست و گریباں ہے۔ سرشار بے تکلف قہقہے پر قہقہہ لگاتا ہے۔ آزاد بھی ہنستا ہے مگر اس کی ہنسی مسکراہٹ کی حد سے نہیں بڑھنے پاتی۔ آزاد

ہر مضمون کو فلسفی نگاہ سے دیکھتا ہے اور غور و فکر کے سانچے میں ڈھالتا ہے
سرشار ہر عالم کی سیر مصور کی آنکھ سے کرتا ہے اور جو کیفیت دیکھتا ہے
اس کو ظرافت کے پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ دونوں کا انداز تحریر دیکھو۔

آزاد۔ کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہونچائیں، انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اپنے نام کی زندگی سے بھی محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ جن کی کوششوں سے ہمارے علمی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گراں بار احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحہ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل وعیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مرنا ہے جس سے ان کے کمال مرجائینگے اور یہ حقیقت میں سخت غمناک حادثہ ہے۔ ایسے بزرگان باکمال کے رویہ اور رفتاروں کا دیکھنا انہیں ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ کر دکھاتا ہے اور ہمیں بھی دنیا کے پیچیدہ راستوں میں چلنا سکھاتا ہے۔" (آب حیات)

سرشار۔ الٰہی یہ کیسی ہوا چلی کہ پیارے ہندوستان کے علم وفضل کا پھلا پھولا چمن اداس ہوگیا، اولوالعزمی کی ہری ہری شاخیں ایک ہی جھونکے میں جھپٹ پڑیں عظمت کے تناور اور بار آور درخت اراراکر زمین پر آرہے۔ خزاں کے لشکر نے ایسا نرغہ کیا کہ بہار علم کا عمل کھڑے کھڑے اٹھ گیا۔ اب اہل ہند میں وہ جوش نہ وہ خروش ہے جسے دیکھو بادۂ غفلت کے نشہ میں مدہوش ہے۔ خواب خرگوش میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں، خیر خوب نیند بھر کر سو چکے۔ اب بھی جاگیں تو ہم

سمجھیں کہ بخت خفتہ بیدار ہو گیا۔

شب نیمہ گذشت و صبح سر زد   اے مرد خدا بہ خواب تا کے
(شمس الضحیٰ)

حضرت سرشار نے علاوہ فسانۂ آزاد کے بہت سے ناول لکھے اور اکثر انگریزی ناولوں کے ترجمے بھی کئے۔ ان تصنیفات میں "سیر کہسار" "جام سرشار" "کامنی" اور "خدائی فوجدار" زیادہ تر مشہور ہیں۔ "سیر کہسار" میں ادنیٰ درجے کی مسلمان سوسائٹی کا نقشہ کھینچا ہے۔ عبارت شوخ اور رنگین ہے۔ مگر "فسانۂ آزاد" کے مقابلے میں سست ہے۔ "کامنی" کی کیفیت پیشتر تحریر ہو چکی ہے۔ "جام سرشار" بھی فسانۂ آزاد کی کیفیت سے خالی ہے۔ "خدائی فوجدار" "ڈان کوئک زاٹ" کا ترجمہ ہے۔ اس کا رنگ ان کی تصنیفات میں بہت پھیکا ہے۔ لکھنؤ سے حیدرآباد جانے کے قبل چھوٹے چھوٹے ناولوں کا ایک سلسلہ "خمکدۂ سرشار" کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ "ہشو" "کرم دھم" "بچھڑی ہوئی دلہن" "طوفان بے تمیزی" وغیرہ اسی سلسلہ میں تصنیف ہوئے مگر ان ناولوں کو دیکھ کر انیس مبرور کا شعر یاد آتا ہے۔

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ   عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

واقعی یہ ناول اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ ایک زبردست مصنف کا کمال اس قدر زوال پذیر ہو سکتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ حضرت سرشار اس خمکدہ کی طرف رجوع ہی نہ ہوتے۔ مگر وہ تو اپنے قابو ہی میں نہ تھے۔ اس خمکدہ کا سلسلہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کا حال حضرت سرشار نے خود "کشمیری کاشی" بابتہ ماہ مارچ

سنہ ۱۸۹۹ء میں یوں تحریر فرمایا ہے۔

"چار برس کا زمانہ ہوا کہ میں کانگریس کا ممبر ہو کر مدراس گیا تھا وہاں سے بخت رسا حیدر آباد دکن لائے۔ یہاں کے ہندو اور مسلمان امرا اور پبلک نے میری بڑی خاطر کی۔ ...... مہاراجہ کشن پرشاد بہادر وزیر فوج آصفی نے جو وزیر اور مدار المہام بھی رہ چکے ہیں مجھے بلایا اور دو سو کا نوکر رکھ لیا۔ اور شعر و سخن اور نثر کی اصلاح لینے لگے۔ اور کسی کام پر خوش ہوئے تو فوراً ایک اشرفی انعام خلعت اور جوڑے سال میں تین چار بار عطا ہوتے ہیں۔ .... حضور نظام مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ جس روز اول بار میں نے نذر پیش کی اور کتابیں بھی بطریق نذر پیش کیں تو حضور نے یہ شرف بخشا کہ ایک گھنٹہ کامل تک ناول "سیر کہسار" کی عین دربار و ربار میں سیر کی۔ "جام سرشار" کا ایک سین ملاحظہ کر کے اپنے سینیر ایڈیکانگ نواب محبوب یار جنگ بہادر سے فرمایا کہ یہ دلچسپ ناول میں پڑھ چکا ہوں۔ میری لائبریری میں موجود ہے میں نے ولادت شہزادہ والا تبار کی تاریخ اسی وقت بذریعہ نواب سردار جنگ پیش کی۔ مادہ تاریخ حضور پُر نور نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز درباریوں میں لکھ لیا گیا۔ اب میرے منصب کی کوشش ہو رہی ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ...... خدا نے چاہا تو پندرہ دن کے اندر میرا نو تصنیف ناول "گور غریباں" شایع ہوگا۔"

حیدر آباد سے حضرت سرشار نے ایک رسالہ موسوم بہ "دبدبہ آصفی" نکالا تھا۔ ابتدا میں اس میں اچھے اچھے مضامین شایع ہوتے رہے۔ خود بھی اکثر لکھتے تھے۔ مگر طرز تحریر میں اگلی سی آب و تاب نہیں رہی تھی۔

گوہر بہاں" ناول خدا جانے شائع ہوا کہ نہیں۔ دبدبۂ آصفی میں ایک ناول موسومہ بہ "چنچل نار" سلسلہ وار شائع ہوتا تھا وہ بھی ناتمام رہا۔ اور اچھا ہوا کہ ناتمام رہا۔

حضرت سرشار شاعری میں منظفر علی صاحب اسیر کے شاگرد تھے اپنے استاد کو نہایت محبت کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ منشی اسیر خالی استاد ہی نہیں تھے، بلکہ استاد گر تھے، شاگردوں کو استاد بنا گئے۔ حضرت سرشار کا کلام عاشقانہ اور رندانہ طرز کا ہوتا تھا۔ مگر طبیعت کی شوخی اور زبان کی پاکیزگی عجب عالم دکھاتی تھی۔ اکثر مضمون آفرینی کی طرف بھی جھک پڑتے تھے۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ مشاعرے میں ایسا شعر پڑھا کہ مشاعرہ الٹ گیا۔

بارہا کہتی ہے مڑ کے خنجر سے — حال سب بھری سخت جانی کا

واقعی کیا نازک خیالی اور باریک بینی کی داد دی ہے۔ ایک اور شعر ان کا انہیں کے حسب حال یاد آ گیا۔

میخانے میں سنتے نہیں سرشار کسی کی — پینے پہ جب آئے نہیں تو پھر بس نہیں کرتے

ایک غزل کا مطلع ہے۔ ؎

جوان لف پریشان یار ہم بھی ہیں — سیاہ بخت و تبہ روزگار ہم بھی ہیں

جب پنڈت بشن نراین صاحب دَر کے ولایت سے واپس آنے پر قوم میں طوفان بے تمیزی برپا ہوا۔ تو اس کے فرو کرنے کے لئے ایک مثنوی "تحفۂ سرشار" کے نام سے لکھی، دیکھو تمہید کس مزے کی ہے۔ ؎

آ پیر مغاں کدھر چھپا ہے — لندن کی پلا دو آتشہ مے
رندوں کو جو تو کرےگا سرشار — ہُن برسیگا میکدہ پر اے یار

داتا پلوا شراب اچھوتی — خوشبو خوش رنگ تیز چوکھی
کوثر کی کھنچی نہیں ہے منظور — لیڈی وائن جسے پیئے حور
سرجوش شراب ناب لا دے — بوتل منہ سے مرے لگا دے
بدمست ہوں پی کے ایک چلو — زاہد کو بنائیں خوب الّو
گھنگھور گھرا ہے آج بادل — میخانے کو کر دے تو بھی جل تھل
برسا دے شراب ناب ساقی — دکھلا دے تو آفتاب ساقی
فتوی کاشی کا کون مانے — لاکھوں میں یہیں کھلے خزانے
رم جھم یہ برس رہا ہے پانی — بے مے ہے حرام زندگانی

ایک مقام پر صبح کا عالم یوں دکھایا ہے۔

جھلکا جھلکا سپیدۂ صبح — ہلکا ہلکا سپیدۂ صبح
تارے چھپتے ہیں جھلملا کر — ہے نور سا جلوہ گر فلک پر
بھینی بھینی مہک گلوں کی — اور نغمہ زنی وہ بلبلوں کی
اے ساقی مہ لقا بدہ مے — اے مرد خدا بخواب تا کے
وقت سحر اور خنک ہوا ہے — بے مے سب کرکرا مزا ہے
ایک چلو کے دینے میں یہ تکرار — اٹھو جاگو سحر ہوئی یار
دریا کی طرف چلے نہانے — غٹ پریوں کے زنان خانے
مرغان چمن بہ نکتہ رانی — چوں برہمنان بہ بید خوانی
نوبت رنگت جما رہی ہے — شہنائی مزہ دکھا رہی ہے

ہاں اتنا ضرور خیال رہے کہ اس مثنوی میں متعدد مقامات پر "گلزار نسیم" سے رنگ و بو لیکر اپنے مضامین کو تازہ کیا ہے۔ ۱۸۹۴ع میں جو کشمیری سوشل کانفرنس ہوئی تھی اس میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جسکا یہ مطلع ہے۔

اٹھا ہمالیہ پربت سے ابر گوہر بار
پھلیں گے پھولیں گے گلزارِ قوم کے اشجار

فارسی بھی کہتے تھے۔ مگر بہت کم۔

عجیب بذلہ سنج، حاضر جواب، ظریف اور خندہ جبیں شخص تھا۔ بات بات میں نکتہ اور ہر نکتے میں ہزاروں رنگینیاں پیدا کرتا تھا۔ ہمیشہ ہنستا ہنستا رہتا۔ چہرے پر مسکراہٹ نور برساتی تھی۔ جس صحبت میں بیٹھ گیا معلوم ہوتا تھا کہ بلبل ہزار داستان چہک رہا ہے۔ زندگی بھر بھی غم و غصہ اور رنج پاس نہ آنے پائے۔ تمام عمر بیباکانہ اور آزادانہ حالت میں کاٹ دی طبیعت کبھی غم و فکر کی طرف مائل ہی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی طبیعت خوب پہچانتا تھا۔ چنانچہ کشمیری سوشل کانفرنس میں جو قصیدہ پڑھا اسمیں تعلّی کے اشعار کے ذمرہ میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

زبان وہ پائی کہ بے نطق سینکڑوں لبِ سا
طبیعت ایسی ملی شوخ بے حجاب انار

واقعی سرشار کی طبیعت ایک چنچل رنڈی ہے جس کی ہر ادا میں شوخی اور ہر انداز میں بانکپن ہے۔ جب یہ شوخی اور بانکپن درجۂ اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں تو دیکھنے والے شرما جاتے ہیں مگر وہ خود نہیں شرماتی اس آزادی اور بیباکی کی وجہ سے کبھی شہرت یا جاہ و ثروت کی آرزو دل میں نہ آنے پائی۔ گو کہ زمانے سے کمال کی سند مل گئی تھی مگر بے نیاز طبیعت نے کسی امیر یا رئیس کے در کی طرف رخ کرنے نہ دیا۔

تمنا دولت دنیا کی اے آتش نہیں رہتی
قناعت سی بھی اک دولت ہے ملتی ہے کسی کو

آخر عمر میں حیدرآباد میں ایک رئیس کے دربار میں رسائی ہوگئی تھی۔ مگر وہ بھی اپنی کوشش سے نہیں۔

عجب ذہن خداداد پایا تھا، فارسی اور عربی میں فاضلانہ لیاقت

نہ تھی۔ مگر طبیعت داری کا یہ عالم تھا کہ علماء اور فضلاء کی صحبت میں اپنا رنگ جما لیتا تھا۔ حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ ہزاروں شعر فارسی اور اُردو کے ازبر تھے۔ یہی اشعار مختلف موقعوں پر اپنے مضامین میں عجب انداز سے چسپاں کئے ہیں۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شعر فلاں موقع ہی کے لئے کہا گیا ہے۔

مگر کیا افسوس کی بات ہے کہ اس باکمال نے اپنی قدر آپ کی بے اعتدالیوں نے بے طرح دل میں جگہ کر لی تھی۔ سرشار اسم بامسمیٰ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبردست مصنف کا کمال روز بروز زوال پذیر ہوتا گیا۔ اور زندگی فارغ البالی کیساتھ نہ بسر ہو سکی۔ سنتے ہیں کہ آخر زمانے میں حیدرآباد میں بھی مہاراجہ کشن پرشاد نے انہیں بے اعتدالیوں سے ناراض ہو کر اپنا دست شفقت کھینچ لیا تھا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی صاحب کمال بڈھا ہوتا ہے تو اس کا کمال جوان ہوتا جاتا ہے۔ لیکن سرشار کی عمر کے ساتھ اس کے کمال میں بھی ضعف آتا گیا۔ اس عالی فہم مصنف کو خود اس امر کا حس تھا۔ چنانچہ کشمیری کانفرنس والے قصیدے میں اپنے تئیں یوں خطاب کیا ہے۔ ؎

ہے اس کمال پہ لیکن ہزار بار افسوس — کہ تو نے قدر نہ کچھ جانی اپنی خود زنہار
کمال کیلئے لازم جو ہے زوال ضرور — اب ایک قطرہ ہے پہلے تھا قلزم زخار
نہ تاب و تب ہے وہ اگلی سی ہمت گشتہ رہی — نہ ہیں وہ شاہد معنی کے پھول رخسار
نہ وہ حافظہ ہی رہا وہ نہ قوت ادراک — رہے کہاں سے ہر اک شے کی مد آخر کار
اسی زمانے میں تو بھی امیر ہو جاتا — قبول زر میں نہ ہوتا اگر تجھے انکار

یہ زوال لازمی تھا۔ نثاری ہو یا شاعری یہ سب دماغ کا کھیل ہے۔ آب آتش

نے جب دماغ ہی میں آگ لگا دی تو گلہائے مضامین بھی آتشبازی کے پھول ہو کر رہ گئے۔ طبیعت بجھ گئی۔ کلام میں گرمی نہ باقی رہی۔ یہ ممکن نہیں کہ ایسا ذہین اور ذکی شخص اس بلائے بے درماں کے اثر سے واقف نہ ہو۔ چنانچہ اپنے مختلف مضامین میں اس کی ہجو و مذمت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اپنے اوپر بس نہیں چلا۔ استاد سچ کہہ گیا ہے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اس لکھنے سے ہماری مراد نکتہ چینی نہیں اگر کسی قسم کی گستاخی کا شبہہ بھی ہو تو ہم مرحوم کی روح سے نہایت ادب کے ساتھ معافی مانگتے ہیں۔ ہاں بیشک یہ باتیں ہمارے دلوں کو عبرت کا سبق دیتی ہیں۔ ہائے اس باکمال کا دماغ اگر اپنی اصلی حالت پر رہتا تو خدا جانے وہ کیسی کیسی بلند پروازیوں کی ہوا میں اڑتا اور کیسے کیسے تارے انشا پردازی کے عرش سے توڑ کر لاتا۔ بہر حال جن لوگوں کو ابھی کچھ دن اور اس خرابہ میں عمر کاٹنی ہے ان کو اس دردناک مثال سے سبق لینا چاہئے۔ کہتے ہیں آخر عمر میں تپ دروں نے بالکل گھلا دیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آخرکار ۲۱ جنوری ۱۹۰۳ء کو اس دار فانی سے رحلت کی۔ تقریباً پچپن یا چھپن برس کی عمر پائی۔

سرشار فصیح و نکتہ پرور نہ رہا ۔ سرمایۂ نازِ اہلِ جوہر نہ رہا
اعجاز قلم کے جس کے سب قائل تھے ۔ وہ حشر کا اردو کی پیمبر نہ رہا

دیباچۂ گلزارِ نسیم

پنڈت دیا شنکر صاحب کول متخلص بہ نسیم ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے آپ کے والد بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ لکھنو آپ کا وطن تھا۔ بزرگوں سے سنا جاتا ہے کہ وجاہت جس کے لئے عموماً اہل خطہ مشہور ہیں آپ کا حصہ نہ تھی۔ پستہ قامت گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ سلسلہ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔ جیسا کہ اُس زمانے کا دستور تھا۔ اردو فارسی کی تعلیم عالم صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اردو فارسی کا کلام نظر سے گزرتا رہا۔ خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا۔ غرضکہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا خاصہ اچھا مذاق پیدا کر لیا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی سخن اور آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ انکی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں غزل گوئی کا شوق رہا۔ لیکن جو دل کا ولولہ تھا وہ غزل میں نکل سکا جدت طبع نے کہا۔ ۵

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

مگر وسعت کہاں ملے۔ اردو شاعری کی کائنات کیا۔ غزل، قصیدہ، رباعی یا مثنوی۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا اس زمانے میں ہر طرف چرچا تھا۔ اصناف سخن میں مثنوی کا رنگ ایسا پسند آیا کہ خود بھی اس کوچے میں قدم رکھنے کی کوشش کی مناسبت طبع نے آمین کہا۔ غرضکہ گل بکاولی کا قصہ جو کہ نثر میں تھا اس کو نظم کے سانچے میں ڈھالا پچیس برس کی عمر میں یہ مثنوی تیار ہوئی۔ چونکہ گلہائے مضامین سے پر تھی لہذا نام "گلزار نسیم" رکھا۔ واقعی

اس گلزار کا کیا کہنا تھا۔ ع

سینچا تھا جس کو خونِ جگر سے وہ باغ تھا

لیکن جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی اس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لیگئے تو انہوں نے کہا ارے بھئی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھیگا یا تم پڑھوگے تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤنگا استاد کامل کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی نظر ثانی کی۔ جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے بلکہ جو مطلب چار شعروں میں ادا ہوتا تھا اس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کیا۔ اس صورت میں گلزار نسیم کو خس و خاشاک سے پاک کیا اور آتش کے پاس لے گئے۔ استاد نے شاگرد کی محنت پر آفریں کہی اور اصلاح کا قلم اٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحیں نسیم نے نہ مانیں اور اشعار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا۔ مثلاً مثنوی کا ایک شعر تھا[ا]

قلیان پئے مشک بو دھواں دھار بیڑے چکنے پان کے مزیدار

آتش نے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح بدلنا چاہا۔ ع بیڑے چکنے مزیدار لیکن نسیم کو یہ اصلاح پسند نہ آئی اور مصرع کی تبدیلی مناسب نہ سمجھی[ا] غرض کہ آتش کی نظر ثانی کے بعد یہ مثنوی ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی جس میں

[ا] یہ واقعہ میر رضا حسین صاحب سہا کی زبانی مجھ کو معلوم ہوا یہ بزرگ آتش کے شاگرد رشید میر وزیر علی صبا کے داماد اور شاگرد تھے یہ ان معدودے چند بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے پرانے استادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور جنکی وضع کے بزرگوں سے ابتک لکھنؤ میں اردو شاعری کا نام زندہ ہے۔ تین چار سال کا عرصہ ہوا کہ قضا کی۔ ع

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

لکھنؤ کے تمام سربرآوردہ شعرا جمع تھے۔ بعد ازاں طبع ہوئی۔ شایع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ زمانے نے پورے طور سے قدر کی۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا۔ اب گلزار نسیم کے بھی جا بجا چرچے ہونے لگے۔ جواہر سخن کے پرکھنے والے سمجھ گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے۔ موتی پروئے ہیں۔ نسیم کو بھی شہرت عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی۔ اور واقعی حق یہ ہے کہ جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اس وقت تک گلزار نسیم کو شادابی میں فرق نہیں آسکتا۔ مگر افسوس کہ نسیم کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ گلزار نسیم کو طبع ہوئے ایک برس گذرا تھا کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی۔ ہیضہ کی بیماری نے دفعتاً خاتمہ کر دیا۔ اپنے شعر کے آپ ہی مصداق ہوئے۔ ؎

روح رواں وجسم کی صورت میں کیا کہوں جھونکا ہوا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

۱۸۴۳ء میں تخمیناً بتیس سال کی عمر میں وفات پائی۔

سخن شناس جانتے ہیں کہ نسیم نے گو کہ میر حسن کے مقابلے پر مثنوی کہی لیکن بالکل دوسرے رنگ میں کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چیں نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اپنے رنگ میں فرد ہیں تو یہ اپنے طرز میں یکتا ہے اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو۔ اگر باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزار نسیم کی سیر کرو۔ دیکھو فراق یار میں صدمے گذرنے کا مضمون ایک ہی ہے۔ دونوں استادوں کی طبعیت اس مضمون پر برابر لڑی ہے۔ مگر دونوں کے انداز سخن پر خیال کرو۔

میر حسن

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جا نہیں اضطراب لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

خفا زندگانی سے ہونے لگی | بہانے سے جاجا کے سونے لگی
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اُسے | محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کسی نے اگر بات کی بات کی | یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے | کہا خیر بہتر ہے، سنگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اُسے | غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نسیم

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی | کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں | آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ | کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذری بے خور و خواب | زائل ہوئی اسکی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ | ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آزنگے بیٹھے بیٹھے چپکر | فانوس خیال بن گیا گھر

دونوں نے اپنے رنگ میں حق سخنوری ادا کیا۔ میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شب ہجراں کی بیقراری کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعارہ کی نزاکت تشبیہوں کی پختگی سے مصنف کا زور طبیعت معلوم ہوتا ہے۔ نازک خیالی اور بلند پروازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے جہاں پہنچتے ہوئے ہمارے طائر خیال کے پر جلتے ہیں۔ غرضکہ اگر صورت حال کا بیان میر حسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میر حسن کہتے ہیں۔ ؎

سب اعضا بدن کے موافق درست | ہر اک کام میں اپنے چالاک و چست
قد و قامت آفت کا ٹکڑا اہتمام | قیامت کرے جسکو جھک کر سلام

نسیم اسی مضمون کو اپنے رنگ میں ادا کرتے ہیں۔ ؎

دن دن اسے ہو گیا قیامت | بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت
چلتی تو زمیں میں سرو گڑتے | باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

یا حسن تعمیر کا مضمون دونوں نے اپنے اپنے طرز پر نظم کیا ہے۔

میر حسن عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان | لگے جس میں زربفت کے سائباں
چقیں اور پردے بندھے زرنگار | دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

نسیم۔ گرد اس کے ستون تھے ساعد حور | چلمن مژگانِ چشم مخمور
دکھلاتا تھا وہ مکان جادو | محراب سے در سے چشم و ابرو

شاہزادے کے غائب ہو جانے پر میر حسن نے پس ماندہ لوگوں کی پریشانی کا حال اس صورت پر نظم کیا ہے۔ ؎

کھلی آنکھ جو اک کی واں کہیں | جو دیکھا تو واں شاہزادہ نہیں

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی | کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی | کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو | گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
ہوا گم وہ یوسف پڑی پھر یہ دھوم | کیا خادمانِ محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا | عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا
گئیں لے کے وہ شہ کو لبِ بام پر | دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیم بر
جو دیکھی جگہ وہ جہاں سے گیا | کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
سے جواں اب کدھر جائے پیر | نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحرِ غم میں ڈبویا مجھے | غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

پھول کے غائب ہو جانے پر بکاؤلی کے اضطراب کی تصویر نسیم نے اپنے رنگ میں یوں کھینچی ہے۔

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل۔ — جھنجلائی کہ کون لے گیا گل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو گل اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا
گھبرائیں خواصیں صورت بید — اک ایک سے پوچھنے لگی بھید

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت میں یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اسکا صبا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
گلچیں کا جو ہاے ہاتھ لوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا بتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

میر حسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔ ایک کی زینت حسن صورت سے ہے۔ دوسرے کی شان لطف معنی سے

سختی سہی اکڑی اٹھائی | افتاد بھی جو پڑی اٹھائی

اس رنگ کے اشعار گلزار نسیم میں کثرت سے ملیں گے۔ واقعی اس رنگ کو خوب نباہا ہے۔ اور طرہ یہ کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ۔ تناسب لفظی کی صنعت کا لطف یہ ہے کہ یہ کسی مقام پر نہ معلوم ہو کہ فلاں لفظ خواہ مخواہ شعر میں اس لئے بھر دیا گیا ہے کہ دوسرے لفظ سے تناسب رکھتا ہے اور یہ لطف گلزار نسیم میں ہے۔ مثلاً کیا خوب مصرع ہے۔ ع

سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے

اس مصرع میں سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیت دکھا رہا ہے لیکن دونوں لفظ اس خوبصورتی سے آئے ہیں کہ بالکل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اور الگ بھی۔ حالانکہ ایک کی رونق دوسرے کی وجہ سے دوبالا ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سایہ کا لفظ خواہ مخواہ دھوپ کے لئے لایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس صنعت کا خوبی کے ساتھ نباہنا آسان نہیں ہے۔ یہ راہ بڑی کٹھن ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً امانت کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجے تک پہونچ گیا ہے لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہیں ہے اور طبیعت میں شستگی کا جوہر نہیں لہٰذا جو شعر اس رنگ میں کہا ہے اسے پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ے

پانی نہ آبرو پہ پھیرے بہر حرص مال | موتی ملیں تو دانت نہ اپنے نکالئے

ایک اور شعر اسی رنگ میں ہے۔ ے

قبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت | بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

سبحان اللہ کیا تناسب الفاظ ہے نیم حکیم اور نیم ملا سنے تھے اس شعر کا مصنف نیم شاعر ہے۔ ایک صاحب نے گلزار نسیم کا جواب کہا ہے اور چونکہ تناسب

قائم ہے۔ میر حسن سخن آفریں ہیں۔ نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں۔ استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے۔ مگر اتنا کہنا ناانصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام میں ہے۔ وہ نسیم کے کلام میں نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو درد عموماً شعرائے دہلی کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ اہل لکھنؤ کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ مگر بایں ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے نسیم کی مثنوی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے طائر شہرت نے پر پرواز نکالے تو یہ کسی کے خرمن کے خوشہ چیں نہ خیال کئے گئے بلکہ خود صاحب طرز کہلائے۔

گلزار نسیم کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا حصہ ہے تناسب لفظی ہے۔ تناسب لفظی کی صفت ہمیشہ اردو شاعروں کے پسند خاطر رہی ہے۔ لیکن کسی نے اس کو اس درجہ کمال پر نہیں پہونچایا جیسا کہ "گلزار نسیم" میں ہم دیکھتے ہیں۔ چند اشعار تمثیلاً لکھے جاتے ہیں۔ ؎

پردہ سے جو دایہ نے نکالا
پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

اک مرغ ہوا اسیر صیاد
دانا تھا طائر چمن زاد

پالا تو مفارقت ہے انجام
دانا ہے تو مجھ سے لے مرے دام

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجئے
سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے

سودا ہے مری بکاؤلی کو
ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

لفظی گلزار نسیم کا خاص جوہر ہے لہذا لکھنؤ والوں نے بھی اس رنگ کے شعر کہے ہیں مگر لطافتِ سخن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک شعر ان کا بھی تمثیلاً لکھا جاتا ہے۔

پاجی ہیں شریفے سب اجڑ جائیں
بیری ہوئے بیر کیڑے پڑ جائیں

اپنے نزدیک ان صاحب نے یہ شعر نسیم کے ذیل کے شعر کا جواب کہا ہے۔

سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

لیکن سخن شناس جانتے ہیں دونوں شعروں میں اندھیرے اجالے کا فرق ہے۔ خلیل کا بھی ایک شعر اس رنگ میں یاد آگیا۔

وہ شمع رو تپنگ اڑاتا ہے شاید آج
کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے میں ڈھیل کی

یار بند کہتے ہیں۔

میلا ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج
تم کس لئے نہ غیرتِ شمس و قمر گئے

فلق بھی طلسم الفت میں کہتے ہیں۔ ع

قند لب پی رہے تھے گڑ گڑیاں

ان اشعار کے تمثیلاً پیش کرنے سے محض یہ مراد ہے کہ تناسب الفاظ کا لطافت کے ساتھ نباہنا اک امر دشوار ہے۔ نسیم کو اس رنگ میں ید طولیٰ حاصل ہے الفاظ کی الٹ پھیر سے وہ کام لیا ہے کہ کلام کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔ آتش کا شعر ان کی شاعری پر صادق آتا ہے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ کہیں کہیں نسیم سے بھی تناسب الفاظ کے ساتھ لطافت سخن قائم نہیں رہ سکی۔ مثلاً کہتے ہیں۔

ان مختصروں نے جب دیا طول
بولی وہ بکاولی کہ معقول

پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل
پہونچا لبِ حوض سے نہ چنگل

لیکن اس قسم کے اشعار کل مثنوی میں دو فیصدی سے زیادہ نہ ملیں گے۔ لہذا قابل معافی ہیں۔

اختصار جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے اس مثنوی کا عجیب جوہر ہے۔ واقعی دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ کل مثنوی میں ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملیگا بعض مقامات پر طول طویل مضامین کو چند شعروں میں اس خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے کہ کسی قسم کی کوتاہی کا شبہہ بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً صحرائے طلسم کی داستان میں مندرجۂ ذیل دو شعر کتنے پر معنی ہیں اور کسقدر اختصار لیے ہیں ؎

طوطا بن کر شجر پہ جا کر | عیش کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے پھل گوند چھال لکڑی | اس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی

یا ایک مقام پر تین چار داستانوں کا خلاصہ کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

وہ جعل وہ ہار وہ غلامی | وہ گھات وہ جینا تمامی
وہ دسترس اور وہ پائے مردی | وہ بیکسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر | وہ حلوہ کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی وہ دیونی کی صحبت | محمود اکی وہ آدمیت
تجویز کی وہ سرنگ کی راہ | اور موش دوانیاں وہ دلخواہ
وہ سیر چمن وہ پھول لینا | وہ عزم وطن وہ داغ دینا
وہ کور کے حق میں خضر ہونا | وہ غولوں سے ملکے پھول کھونا
وہ بال کو آگ پر دکھانا | وعدے پر دیونی کا آنا
وہ نزہت گلشن نگاریں | وہ دعوت بادشاہ وہ تمکیں
گذرا تھا جو کچھ بیان کیا سب | پنہاں تھا جو کچھ عیاں کیا سب

یا اکثر دو تین شعر کا مطلب ایک شعر میں ادا کر دیا ہے ؎

تیورا کے وہیں وہ باربردوش　　بیٹھا تو گرا، گرا تو بیہوش

مفلس زردار امیر قلاش　　نوکر تاجر فقیر خوش باش

اقرار میں تھی جو ہچکچائی　　شرمائی لجائی مسکرائی

پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت　　پوچھا کہ طلب کہا قناعت

میر حسن کی مثنوی میں معاملہ برعکس ہے۔ اس میں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے۔ اور یہی اس مثنوی کا بہت بڑا عیب ہے۔ علاوہ بریں نسیم کے کلام میں وہ پختگی اور ترکیب میں وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش ملا فیضی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے۔ واقعی کیا پرشوکت کلام ہے۔

پر بحرِ سخن سدا ہے باقی　　دریا نہیں کا رند ساقی

مرغان ہوا تھے ہوش راہی　　نقشِ کفِ پا تھے ریگِ ماہی

سائے کو پتہ نہ تھا شجر کا　　عنقا تھا نام جانور کا۔

جاگی مرغِ سحر کے غل سے　　اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

پانچوں سرِ پنجۂ وفا تھے　　یا مطلعِ خمسۂ صفا تھے

لے آئینہ وار خود نمائی دے سرمۂ چشم آشنائی

اک شب تھی کہ خال روی شامت یا مردم دیدۂ قیامت

خورشید بصر گہن سے چھوٹا خیرات سے کے زر کا قفل ٹوٹا

انسان سے جھکی پری کی گردن کانٹے سے رکا ہوا کا دامن

تسنیم نے عموماً مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ اور نہایت لطافت کے ساتھ مثلاً ذیل کے دو اشعار تشبیہ کامل کا نمونہ ہیں۔ سه

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چیگر فانوس خیال بن گیا گھر

محرم جو ہٹی تھی اس قمر کی برجوں پہ چاندنی تھی سر کی

لیکن بعض مقامات پر طبیعت نے تکلف کا پردہ اٹھا دیا ہے اور سادگی سے کام لیا ہے ایسے اشعار جو ہیں وہ لاجواب ہیں اور ضرب المثل ہوگئے ہیں۔ مثلاً

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار اب مان نہ مان تو ہے مختار

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے مختار ہے جس طرح بنا ہے

پانی نہ خاک گو رواں ہے — تو شعلہ کی سوئے آسماں ہے

انسان و پری کا سامنا کیا — مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے — جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے

درویش رواں رہے تو بہتر — آب دریا بہے تو بہتر

نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور اسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہئے ۔ واقعی کیا خوب کہا ہے ؎

لپٹی تھی جو زلف کروٹوں میں — بل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں

نور آ گیا چشم آرزو میں — آیا پھر آب رفتہ جو میں

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں — غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں — گر ذبح کیا تو منتِ پر ہوں

اس نام کے اس لقب کے صدقے — اس نامہ کے اس طلب کے صدقے

کیوں منہ پہ شفق خوشی سے پھولی — کیا شام وصال راہ بھولی

منہ پھیر کے ایک مسکرائی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

چتون کو ملا کے رہ گئی ایک　　ہونٹوں کو ملا کے رہ گئی ایک

کیا رنگ زمانے نے دکھائے　　گل لینے گئے تھے داغ لائے

راتوں کو جو گنتے تھے ستارے　　دن گننے لگے خوشی کے مارے

گلزار نسیم کی زبان میں اور آج کل کی زبان میں کچھ ترقی نہیں ہے۔ صرف بعض محاورے جو کہ نسیمؔ کے وقت میں رائج تھے اب متروک ہو گئے ہیں۔ مثلاً نسیم کہتے ہیں۔ ؎

پل مارنے کی ہوئی جو دیری　　سبحان اللہ شان تیری

اب "دیری" متروک ہے۔ "دیر" جو زیادہ فصیح ہے رائج ہے۔

یا ایک شعر ہے۔ ؎

ٹھہری یہ غرض کہ آج کی رات　　فیروز شہ آگے چھیڑیئے بات

اب یوں کہیں گے فیروز شہ کے آگے چھیڑیے بات۔

غرضکہ تناسب لفظی، اختصار، پختگی کلام، چستی بندش، شوکت الفاظ، پاکیزگی زبان اس مثنوی کے خاص جوہر ہیں۔ اور استعاروں اور تشبیہوں سے جو مینا نگاری کی ہے اس نے اور حسن دو بالا کر دیا ہے۔ اس مثنوی کے مقبول ہونے کا راز یہی ہے کہ باوجود اس اختصار کے یہ اتنے محاسن کا مجموعہ ہے اور حق یہ ہے کہ زمانہ نے جیسی اس کی قدر کی اس پر ہر مصنف کو ناز ہو سکتا ہے۔ پسند عام کیسا تھ قبول خاص کا شرف گلزار نسیم کو حاصل ہے۔ اتفاداں

سخن کا سرتاج اور اردو زبان کا مستند مورخ محمد حسین آزاد لکھتا ہے۔

"پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم لکھی اور بہت خوب لکھی۔ اس کی عام و خاص سب میں شہرت ہے۔ اس کے نکتے اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں جتنی سمجھ میں آتی ہے اس پر خوش ہوتے ہیں۔ اور لوٹے جاتے ہیں۔ . . . . . ہمارے ملک سخن میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنہوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک سحر البیان دوسری گلزار نسیم۔" (آب حیات)

مگر طبائع کا رنگ مختلف ہے۔ جہاں منصف مزاجوں نے گلزار نسیم کی قدر [illegible] اکثر نگاہوں میں اس باغ کی شادابی کانٹا بنکر کھٹکی۔ ان حضرات نے اپنی اپنی ہمت کے موافق نسیم کی شہرت پر خاک ڈالنے کی فکر کی ہے۔ چنانچہ ابتک اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آتش نے یہ مثنوی کہہ کر نسیم کو دے دی تھی۔ لیکن میری رائے میں اس دعوی بے دلیل پر جس قدر ہنسیں بجا ہے۔ ایک معنی میں یہ بہتان قدر دانان نسیم کے لئے باعث فخر ہے اس سے بڑھکر نسیم کی شاعری کی تعریف کیا ہو سکتی ہے کہ اسکا کلام آتش ایسے زبردست استاد کی طرف منسوب کیا جائے۔ حالانکہ سخن شناس جانتے ہیں کہ جس رنگ میں گلزار نسیم کہی گئی ہے اس رنگ میں آتش نے اپنی زندگی میں ایک شعر نہیں کہا۔

ایک تذکرہ نویس صاحب فرماتے ہیں کہ نسیم مشرف باسلام تھے۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا۔ خیر یہ تو پرانے زمانے کے لوگوں کی طباعی ہے اس زمانہ میں مولانا حالی نے گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم سے پامال کرنا چاہا ہے آپ فرماتے ہیں کہ "مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ

بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے۔ مصنف گلزار نسیم نے اس کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ گلزار نسیم میں دو شعر اس صورت پر ہیں۔ ؎

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکیگا کسی کو الخ

جو مطلب کہ مصنف ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ تو اس طفل مہ جبیں کو دیکھکر خوش ہوتے تھے مگر نجومیوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھکر پھر کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔ (کیونکہ اس کو دیکھکر بینائی نہ باقی رہے گی) ظاہر ہے کہ ان دونوں بیتوں میں جب تک کئی لفظ بڑھائے اور جب تک کئی لفظ بدلے نہ جائیں تب تک یہ مطلب جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا اور پہلا مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہو سکتا (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۵ سطر ۴-۱۲) اس کے جواب میں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اگر مولانا حالی گلزار نسیم کا کوئی صحیح نسخہ ملاحظہ فرماتے تو مولانا موصوف کو اس اعتراض کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑتی۔ آج کل گلزار نسیم کے بے شمار نسخے شایع ہوتے ہیں جنمیں سیکڑوں جگہ کاتب کی اصلاحیں ہوتی ہیں۔ اور تو اور اکثر اشعار ان نسخوں سے غائب ہیں۔ اور جو ہیں ان کی ترتیب میں غلطی ہے چنانچہ یہ دو شعر بھی جو مولانا حالی کی طبع گرامی کے بار خاطر ہوئے صحیح نسخے[1] میں اس صورت پہ ہیں

---

[1] یہ نسخہ کمیاب ضرور ہے لیکن لکھنؤ میں پرانے بزرگوں کے پاس ملیگا۔ باقی صـ ۶۸ پر ملاحظہ ہو۔

خوش ہوتی ہے طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو

اب مطلب صاف ہے اور مصرعوں میں کامل ربط ہے۔ یعنی طفل مہ جبیں سے خوش ہوتی ہے۔ ستارہ بیں سے یہ ثابت ہوا کہ یہ لڑکا پیارا تو ہے مگر اس کو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔

دوسرا اعتراض ملاحظہ ہو۔ نسیم کا شعر ہے۔

نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو چشمک تھی نصیب اس پدر کو

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ "بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے۔ مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے لیئے ظلمت تھا۔ پس جب تک دوسرے مصرع کے

۱؎ اس نسخہ کی شناخت یہ ہے کہ اس کے آخر میں ذیل کی عبارت درج ہے "پنڈت دیا شنکر متخلص بہ نسیم کہ در فن شاعری کمالے بہم رسانیدہ اند . . . . قصہ تاج الملوک و بکاولی را از نثر بہ نظم آوردہ بہ گلزار نسیم موسوم ساختہ بود . . . در بیت السلطنت لکھنؤ محلہ محمود نگر متصل اکبری دروازہ در مطبع حسینی سیدی و سندی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل مرحوم و مغفور بہ تصحیح و مقابلہ مصنف علیہ طبع پوشید" اس نسخہ میں مصنف کی طبعزاد تاریخ طبع مثنوی بھی درج ہے جو کہ آج کل کے نسخوں میں نہیں ملتی۔ ؎

اے خالق کردگار شکرا ؎ شکراً شکراً ہزار شکراً
کیں زابتدا خبر داد ؎ شاخ قلم چنیں ثمر داد
در عہد خلافت شہنشاہ ؎ امجد علی شاہ خلد اللہ
سید حسن آنکہ طبع پاکش چوں مطبع اوست خوب و دلکش
از سعی رسا شنیدہ و بتوددہ ؎ در مطبع خویش طبع فرمود ؎ چوں نو طبع نیک پوشید ؎ بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع
۱۲۶۰

یہ نسخہ حالی امو، پرانے نسخہ کی نقل ہے۔ گو اس پرانے نسخہ میں بھی چھاپے کی غلطیاں موجود ہیں مگر بہت کم۔

الفاظ نہ بدلے جائیں کلام مربوط نہیں ہو سکتا" (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۶)۔
میں اس اعتراض کی تہ کو بالکل نہیں پہونچا۔ مجھ کو یہ شعر کسی صورت پر بے ربط نہیں نظر آتا۔ جو مضمون مولانا حالی نے نثر میں بیان کیا ہے وہی نظم کے پیرائے میں ظاہر کیا گیا ہے۔ نسیم کے اس شعر پر اعتراض کرنا ہوا سے لڑنا ہے
تیسرا اعتراض مولانا حالی کا یہ ہے کہ نسیم کا ذیل کا شعر اصلاح طلب ہے۔

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ　　　نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

آپ فرماتے ہیں کہ اس شعر کے دونوں مصرع مربوط نہیں ہیں کیونکہ ظاہرا الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ "شاہ" اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے۔ حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے۔ (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۶ سطر ۱۴-۱)

اس اعتراض کی نسبت صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اصل شعر اس صورت پر ہے۔

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ　　　نظارہ کیا پسر کا ناگاہ

ابھی لکھنؤ میں ایسے بزرگ موجود ہیں جن کو قریب قریب کل مثنوی حفظ ہے ان کی زبان سے یہ شعر اسی صورت پر سنا گیا ہے۔

نسیم نے بکاؤلی کے اضطراب کے بیان میں چند شعر کہے ہیں۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں　　　آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں۔
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ　　　کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذری بے خور و خواب　　　زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ　　　ہئیت میں مثال رہ گئی وہ

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ ان اشعار میں تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا

مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا اور ظاہر مصنف نے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں ہے مصنف کو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔ اور کپڑوں کے عوض رنگ بدلتی تھی۔ (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۲۵ سطر ۲-۹)

مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا موصوف اصول شاعری سے بیخبر ہیں۔ نازک خیالی اور بلند پروازی جو کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے جوہر ہیں ان اشعار میں موجود ہیں۔ پھر ان کو بے معنی کہنا چہ معنی دارد۔ وجہ یہ ہے کہ مولانا حالی مغربی شاعری کی پیروی کی فکر میں انگریزی نظموں کے ترجمے پڑھتے ہیں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے سے ان نظموں کے نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر تشریف لے جاتے ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں کی پیچیدگیاں قائم نہیں رہتیں لہذا آپ خیال کرتے ہیں کہ مغربی شاعری کا اصول یہ ہے کہ عبارت سادہ نظم کر دی جائے اور اس خیال کے موافق اردو کے جن اشعار میں آپ نازک خیالی اور باریک بینی کی وجہ سے کسی قسم کی پیچیدگی پاتے ہیں اس کو بے معنی اور مہمل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش اور پُرتاثیر ہو۔ نثر کا انداز یہ ہے کہ جو مضمون بیان کیا جائے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ ان سے ایک خاص معنی صاف طور پر پیدا ہوں۔ برخلاف اس کے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترتیب الفاظ ایسی ہو کہ

اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گذر جائیں۔ اگر اس اصول کو پیش نظر رکھکر اشعار مرقومہ بالا کی وقعت کا اندازہ کیا جائے تو وہ بے معنی نہ نظر آئیں گے بلکہ ایک کوزۂ دریا نوش کی کیفیت نمایاں کریں گے۔ مثلاً پہلے شعر کا یہ مطلب ہے کہ اس کے دل پر فراق یار کا صدمہ ایسا تھا کہ کھانے پینے کی اس کو مطلق فکر نہ تھی اگر کوئی شخص اس قسم کا ذکر بھی کرتا تھا تو ٹال دیتی تھی۔ بس دن رات ضبط گریہ کئے پڑی رہتی تھی اگر کوئی کھانے پینے پر اصرار کرتا تھا تو قسمیں کھاتی تھی کہ میں نہ کھاؤنگی"۔ یہ ظاہر ہے کہ نثر میں یہ مضمون اس وضاحت کے ساتھ وہ لطف نہیں رکھتا جو لطف کہ نظم میں اختصار کے ساتھ پیدا کرتا ہے اسی طرح دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ "وہ اپنی زندگی سے تنگ تھی۔ اپنی آسائش کا اس کو مطلق خیال نہیں رہتا تھا۔ یہانتک کہ کپڑے بھی نہیں بدلتی تھی۔ بیشک طرح طرح کے صدمے جو اس کے دل پر گذرتے تھے تو اسکے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا"۔ چوتھا شعر بھی شاعری کی تصویر ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی قوت خیال کا کمال دکھایا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ "وہ ایسی نحیف و زار ہو گئی تھی کہ اس کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک تصویر خیال روبرو ہے جس میں نہ دم ہے نہ تاب و توان۔ اس کی عجیب ہئیت ہو گئی تھی۔ بس ایک سکتہ کا عالم طاری تھا۔ عالم اجسام کے رہنے والوں کی اس میں کوئی بات باقی نہیں رہی تھی وہ اپنی اگلی ہستی کا محض ایک شبہ ہو کر رہ گئی تھی"۔

ان اعتراضات کو دیکھکر انیس مرحوم کا ایک قطعہ یاد آتا ہے[1]

---

[1] مولانا حالی کے اعتراضات کی نسبت صرف میری ہی یہ رائے نہیں۔ باقی ص ۸۲

مزہ یہ طرفہ کہ مضمون تو دستیاب نہیں مقابلے پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو
غلط یہ لفظ وہ بندش بری وہ مضمون سست ہنر عجیب ملا ہے یہ عیب بینوں کو

لیکن ان نکتہ چینیوں سے نسیم کی شہرت میں فرق نہیں آسکتا جبتک اردو شاعری کا مذاق قائم ہے اور طبیعتوں میں جوہر شناسی کی قابلیت باقی ہے گلزار نسیم کی تازگی قدردانان سخن کے دماغ کو فرحت بخشتی رہیگی ہاں جن لوگوں کے دماغ میں تعصب کی ہوا بھری ہے وہ اس گلزار میں پھول ہٹا کر کانٹے چنا کریں گے۔

صرف اکثر احباب کے اصرار نے مجبور کیا ورنہ میں ان اعتراضات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ کیونکہ ایسے بے بنیاد اعتراضوں کو زمانہ خود فنا کردیتا ہے۔ ان کی تردید کرنا فعل عبث ہے۔ علاوہ مثنوی کے نسیم کا غزلوں کا چھوٹا سا دیوان بھی ہے۔ لیکن ناتمام۔ بہت سی غزلیں جو تلف ہوگئیں ان کا نام و نشان بھی اس دیوان میں نہیں ملتا۔ سن رسیدہ حضرات سے معلوم ہوا کہ چند غزلیں اکثر احباب نے اپنی تصنیف کی اس دیوان میں رکھدی ہیں۔ یہ مفت کرم داشتن کا زرالامضمون ہے مگر یہ غزلیں صاف نسیم کے اصل کلام سے الگ معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ نسیم کی وفات کے بہت روز بعد یہ دیوان شائع ہوا۔ لہذا لوگوں کو اس دست اندازی کا موقع ملا۔ بہرحال جو ذخیرہ اشعار کا نسیم کے زور طبیعت کا یادگار ہے وہ واقعی قدرومنزلت کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔ اکثر مقامات پر

میرے ایک دوست اور مولانا شبلی سے گلزار نسیم کی نسبت کچھ خط وکتابت ہوئی تھی مولانا شبلی نے اپنی ایک تحریر میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بیرحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے ۱۲

طبیعت کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قیامت کرتی ہے مثلاً ؎

بجز گورِ غریباں نقش پا سے پھر نہیں آگے
یہیں تک ہر مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا
نسیم اپنے ہی اعمالوں سے گردش ہی رہا ہوگی
رواں کشتی پہ آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

اے مرغ دل تو شاخ نشیمن سے گر پڑا
حیف آشیاں بلند ہے پرواز پست ہے
تھے موزلف دیدۂ تر دل بھی آ پھنسا
مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخِ گل اک روز جھونکا کھائیگی
جاں نکل جائیگی تن سے اے نسیم
گل کو بوئے گل ہوا بتلائیگی

طریق شعر و سخن میں اگر نہیں اعجاز
قلم کا طرح سے ہر اک شکستہ پا چلتا

ذرے کا بھی چمکے گا ستارہ
قائم جو زمین و آسمان ہے

معنی روشن جو ہو تو سو سے بہتر ایک شعر
مطلع خورشید کافی ہے پئے دیوان صبح

اس میں شک نہیں کہ نسیم کا کلام آتش و ناسخ و ذوق و غالب کے کلام کا ہم پایہ نہیں ہے۔ یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہیں۔ ان کے برابر کسی کو عروج نہیں حاصل ہوا۔ لیکن غزل گوئی کے میدان میں نسیم، رند صبا وغیرہ سے پیچھے نہیں ہیں۔ تینوں استادوں کی ہم طرح غزلوں کے انتخاب درج ذیل ہیں۔ جن غزلوں میں ایک ہی مضمون کے شعر ملے وہ بھی پہلو بہ پہلو لکھدیئے گئے ہیں۔ سخن شناس نگاہ انصاف سے دیکھیں۔

نسیم صہبا کشوں کی خاک ہے ہر ایک مقام پر | ساقی لنڈھا شراب کو متوں کے جام پر

صبا لائی ہے مجھکو وحشتِ دل اس مقام پر | شیشے کی جا ہے قیس کے سودائے خام پر

رند پڑتی ہے آنکھ جب مری مینا و جام پر | سو سو درود پڑھتا ہوں ساقی کے نام پر

نسیم دل ہے ہر دم ہیں آوازِ بکا آتی ہے | بند کانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

رند تیرہ و تار دھواں دھار گھٹا آتی ہے | میکشو فصل ہے ہوش ربا آتی ہے

نسیم گل ہوا کوئی چراغِ سحری او بلبل | ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صبا آتی ہے

رند جانب خانۂ خمار سے کیا آتی ہے | لڑکھڑاتی ہوئی جو بادِ صبا آتی ہے

نسیم چھو لیا دھوکے سے دامانِ صبا تو نے تو کیا | غنچۂ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

رند یہ پتا کوچہ کا اس حور کے سن رکھ قاصد | یوں نہیں چلتی ہے جنت کی ہوا آتی ہے

نسیم خم نہ بنکر خود غرض ہو جائیے گا | مثل ساغر اور کے کام آئیے گا

رند دھوپ دن کی اوس شب کی کھائیے | آستانِ یار پر مر جائیے گا

نسیم آپ آہو چشم ہیں آہو نہیں | ہم سے وحشت کی نہ لیجئے آئیے

رند مجھ سے بیہودہ نہ گرمی کیجئے۔ | ٹھنڈے ٹھنڈے آپ گھر کو جائیے

نسیم ابر رحمت سنتے ہیں نام آپ کا | خاکساروں پر کرم فرمائیے۔

رند دن کو تو تشریف تم لاتے ہو روز | شب کو بھی اک دن کرم فرمائیے

نسیم جوہر تیغِ نگاہ کھل جائے گا | منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

رند کچھ کروں گا میں بھی اب اخذ منت غیبی | چپکے رہئیے منہ نہ اب کھلوائیے

نسیم لائے اس بت کو التجا کر کے | کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

رند کیا ملا عرض مدعا کر کے | بات بھی کھوئی التجا کر کے

نسیم جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا | شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

صبا واعظ کے میں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا | جام شراب لے کے بھی ساقی کدھر گیا

نسیم روحِ رواں کی جسم کی حالت میں کیا کہوں — جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

صبا مثلِ حبابِ بحرِ جہاں میں نے دم لیا — اک موج تھا کہیں اِدھر آیا اُدھر گیا

نسیم گذرا جہاں سے میں تو کہا ہنس کے یار نے — قصہ گیا فساد گیا دردِ سر گیا

صبا اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم — فتنہ گیا فساد گیا شور و شر گیا

نسیم ہے رنجِ عشق تیرے لئے میں برائے رنج — خود بھی مٹے یقیں ہے جو مجھ کو مٹائے رنج

صبا دل ہے غذائے رنج جگر ہے غذائے رنج — پیدا کیا ہے ہم کو خدا نے برائے رنج

نسیم یا تنگیٔ کنار تھی یا اب فشارِ قبر — وہ ابتدائے عیش تھی یہ انتہائے رنج

صبا آدم سے باغِ خلد چھٹا ہم سے کوئے یار — وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج

نسیم ہم شیشۂ شکستہ ہیں تم کیفِ موجِ مے — بنیادِ عیش تم سے ہے ہم سے بنائے رنج

صبا اے صانعِ ازل مری مٹی خراب کی — کیا چاہیے تھی خانۂ دل میں بنائے رنج

نسیم زاردار ہے ذرے ہے مجبور لئے زر پہ نہ زور پر — کیجے نگاہ حالِ سلیمان و مور پر

اک عمر سے وظیفہ ہے صاحب ترے نام کا — ناخن کے خط ہیں انگلیوں کی پور پور پر

صبا ابھی برس جنوں جو رہا زور شور پر — زنجیر ہم چڑھا دینگے مجنوں کی گور پر

دنیا تمام بازیٔ شطرنج باز ہے — مہروں کی طرح ایک کے ہے ایک زور پر

نسیم کسی کے دل سے نہ یارب کوئی خراب گرے — نہ شیشہ طاق سے ٹوٹے نہ شیشے سے شراب گرے

تمہارے دور میں گر خاک پر شراب گرے — پڑے زمیں پہ افتادہ آفتاب گرے

صبا کہوں جو اپنی سیہ فتادہ بزمِ ساقی میں — سبو سے بادہ گرے سیخ سے کباب گرے

صبا بغیرِ یار ہوئی بزمِ مے تہ و بالا — شراب خم سے بھی سیخ سے کباب گرے

نسیم منت دوا کسی کی نہ اصلا اٹھائیے — مر جائیے نہ نازِ مسیحا اٹھائیے

صبا افتادگی سے خاک سے سر اپنا اٹھائیے — ممکن نہیں کہ نقشِ کفِ پا اٹھائیے

نسیم چاہ اپنی مانتا نہیں وہ بے یقیں اگر — قرآن کا جامہ پہنئے گنگا اٹھائیے

صبا

اس بت کو اعتبار کسی بات کا نہیں — قرآن سر پہ رکھیے کہ گنگا اٹھائیے

نسیم

فراق دیدہ ہوں میں وصل یار باقی ہے — خزاں رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے
ہوا تو کہتی ہے صبا آمد بہار چمن — صدائے غنچہ وحدت ہزار باقی ہے
جنون عقل کے قصے سے چھوٹے بعد فنا — نہ پردہ ہے نہ وہ تر دزار باقی ہے
بتوں کے قہر سے ہمکو مقام یاس نہیں — امید رحمت پروردگار باقی ہے

صبا

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے — جنوں کا جوش ہے فصل بہار باقی ہے
خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ واعظ — زبان تو ہے ابھی اختیار باقی ہے
ہزار حیف اسے بھی فلک مٹا دیگا — کہیں کہیں جو یہ نقش و نگار باقی ہے
پھنسائیگا مجھے دشت جنوں کے کانٹوں میں — یہ ایک تنہ جو دامن کا تار باقی ہے

نسیم

کیوں خفا رشک حور ہوتا ہے — آدمی سے قصور ہوتا ہے
جسکو دیکھو وہ اس زمانے میں — اپنے نزدیک دور ہوتا ہے
خاکساری وہ ہے کہ ذروں پر — روز باران نور ہوتا ہے

صبا

بندہ اب ناصبور ہوتا ہے — عفو ہو وے قصور ہوتا ہے
پرتو رخ سے ان کا جیب قبا — دامن کوہ طور ہوتا ہے
اے صبا جب بہار آتی ہے — ہم کو سودا ضرور ہوتا ہے

اس موقع پر یہ لکھنا غیر مناسب نہیں کہ گو یہ آتش کے شاگرد تھے۔ لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا مگر باوجود اس تصنع کے جو کہ اس رنگ کا خاص جوہر ہے۔ نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہیں ہے۔ طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے۔

شاعری کا رنگ تو دیکھ چکے اب طبیعت کا رنگ ملاحظہ ہو۔ سنا جاتا

ہے کہ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے۔ تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجیب عالم تھا۔ حاضر جوابی تیغ زبان کا جوہر تھی۔ انہیں صفات خاص نے ان کا وقار ہم عصر شعرا میں قائم کیا۔ اگر یہ جوہر نہ ہوتے تو کون پوچھتا۔ اس زمانے میں لکھنؤ کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گو کہ اُردو شاعری کے زوال کا زمانہ قریب آچکا تھا۔ لیکن جیسے چراغ کی روشنی بجھنے کے پیشتر تیز ہو جاتی ہے اسی طرح اس زمانے نے شعر و سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ بایدو شاید۔ آتش و ناسخ کی جادو کار طبیعتیں اپنا زور دکھا رہی تھیں۔ انیس و دبیر فن مرثیہ گوئی کو عرش پر پہونچا رہے تھے۔ خواجہ وزیر، صبا، رند و خلیل وغیرہ کی نوجوان اور شوخ طبیعتیں ایک طرف قیامت برپا کر رہی تھیں۔ اس زمانے میں ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ میں اپنا وقار قائم کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن نسیم نے اپنے گلہائے مضامین کا سب کو ہزار جان سے شیدا بنا لیا۔ ایسے ایسے معرکے جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی۔ ایک مشاعرے میں نسیم نے مطلع پڑھا۔ ؎

منت دلا کسی کی نہ اصلا اٹھائیے　　　مرجائیے نہ ناز مسیحا اٹھائیے

آتش بھی اس مشاعرہ میں موجود تھے۔ انہوں نے نسیم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میرا مطلع اس کے آگے گرد ہے۔ مطلع آتش ؎

جاں بخش لب کے عشق میں ایذا اٹھائیے　　　بیمار ہو کے ناز مسیحا اٹھائیے

حضوصاً نسیم کی حاضر جوابی و موزونی طبع کے سب قائل تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہیں مشاعرے کی صحبت تھی یہ بھی وہاں موجود تھے۔ قبل مشاعرہ شروع ہونے کے شیخ ناسخ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرع نہیں سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انہوں۔

جواب دیا فرمائیے۔ ناسخ نے مصرع پڑھا۔ ع

"شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا"

ان کے منہ سے یہ مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرع تیار تھا۔ ع

"تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"

اس مصرع کا سننا تھا کہ حاضرین جلسہ پھڑک اٹھے۔ اور ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی۔ لیکن نسیم نے ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرے میں ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع یہ تھا۔ ع

"جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں"

پہلا مصرع کچھ ڈھیلا سا تھا۔ نسیم کے منہ سے بیساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرع تو خوب ہے لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہیں۔ وہ صاحب بھی جلے تن تھے ان کے کان تک یہ بات پہونچی تو جھنجھلا کر بولے کہ اچھا اس سے بہتر مصرع کہہ دیجئے۔ یہاں تو مضامین ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے اسی وقت مصرع موزوں کر کے سنا دیا۔

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں
"جانب ظلمت ہرگز آفتاب آتا نہیں"

نسیم کی مشاعرے میں دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہو گیا۔

ایک روز آتش کے یہاں شاگردوں کا جمگھٹا تھا۔ رند، صبا، خلیل وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ نسیم بھی موجود تھے۔ صبح کا سہانا وقت، برسات کا موسم مینہ برستا ہوا عجیب کیفیت تھی۔ موسم بہار سے کچھ ایسی طبیعتیں مست ہوئیں کہ شاگردوں نے آتش سے فرمایش کی کہ استاد اس وقت ایک

غزل کہہ ڈالیے۔ گو کہ آتش کا بڑھاپا تھا لیکن طبیعت میں جوانی کا زور بھرا تھا۔ فی البدیہہ اشعار موزوں کرنے شروع کر دیئے اور کہا کہ لکھتے جاؤ۔ جس غزل کا مطلع ہے ؎

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے | کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت میں جوش بہار سے لہرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ان اشعار کی تخمیس کرنی شروع کر دی۔ جتنی دیر میں آتش دوسرا شعر سوچتے تھے اس عرصہ میں ان کے پہلے شعر پر تین مصرعے لگا چکتے تھے۔ اور بعض مصرعے تو واقعی اس انداز سے لگائے ہیں کہ اگر کوئی برسوں فکر میں سرگریباں رہے تو اس سے بہتر مصرعے نہیں لگا سکتا۔ آتش کے دو شعروں کی تخمیس مثالاً لکھی جاتی ہے ؎

نہ خونی کفن ہیں نہ گنج شہید ہیں | نہ زخمی بدن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں
لہو مل کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں | تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں

گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

کوئی جانتا ہے کسی کو خبر ہے | کہ پردے میں کون اے صنم جلوہ گر ہے
کہیں کچھ خیال اور کہیں کچھ نظر ہے | دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے

تمہارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے

اسی طرح چودہ پندرہ شعر کی غزل پر مصرع لگائے ہیں۔ ؎

آتش کے شاگردوں میں صبا سے ان سے بہت یارانہ تھا۔ ان کے مرنے پر صبا نے ایک شعر کہا جو کہ واقعی درد دل کی تصویر ہے۔ ؎

اٹھ گئے ہیں نسیم جس دن سے | اے صبا وہ ہوائے باغ نہیں

لیکن رند سے چشمک تھی۔ چنانچہ ایک مشاعرے میں نسیم نے رند کی ایک مشہور

غزل پر خمسہ پڑھا۔ جس کا مقطع یہ تھا۔ ؎

وصل انسان کا پریزادوں کا ہو ہے دشوار فائدہ کچھ نہیں تم مفت میں کیوں ہوتے ہو خوار
کہتے کہتے تو ہوئے تم کو نسیم اب لاچار عشق کو ترک کرو یا نہ کرو ہو مختار

نیک و بد ہم ہیں نہیں رند سمجھاتے جاتے

اس مصرع کا زبان سے نکلنا تھا کہ۔ ع کہتے کہتے تو ہوئے تم کو نسیم اب لاچار۔ رند نے سر مشاعرہ تلوار کھینچ لی اور نسیم سے برسرپیکار ہونے کا ارادہ کیا۔ نسیم کے مزاج میں بھی بانکپن تھا یہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ تلوار پر نہ بھولنا یہاں ٹھیکروں سے تلوار چھین لیتے ہیں لیکن آفتاب الدولہ قلق وغیرہ اس مشاعرے میں موجود تھے انہوں نے بگڑتی ہوئی طبیعتوں کو سنبھالا اور بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا۔ اور رند سے کہا کہ بندہ نواز یہ تلوار کا مقام نہیں۔ یہاں زور قلم سے کام لیجئے۔ اس ہنگامہ آرائی کی وجہ یہ تھی کہ رند جو ایک رنگین مزاج اور عاشق تن آدمی تھے اس زمانے میں ایک بارگاہ حسن کے امیدواروں میں تھے لیکن قسمت کی نارسائی سے منزل مقصود تک رسائی نہیں ہوئی تھی۔ تلون مزاجی نے اس مایوسی کی حالت کو غیظ و غضب سے بدل دیا تھا۔ نسیم نے اس خمسہ میں درپردہ اسی کیفیت کا اشارہ کیا تھا۔ رند کے چوٹ کھائے ہوئے دل پر یہ طعن آمیز نصیحت گراں گذری اور اس معرکے کا باعث ہوئی۔ علاوہ بریں اسی غزل میں رند کا ایک شعر ہے۔ ؎

راستہ روک کے کہہ لونگا جو کہنا ہے مجھے کیا ملوگے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

نسیم نے ایک صحبت میں اس شعر کا دوسرا مصرع پڑھا تو مذاقاً "ملوگے" تانیث کے ساتھ پڑھا یعنے۔

راستہ روک کے کہہ لونگا جو کہنا ہے مجھے کیا ملوگی نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا اور اس شعر کو لوگ اسی صورت پڑھنے لگے اڑتے اڑتے یہ خبر رند کے کانوں تک بھی پہونچی۔ حریفوں نے اصل واقعہ پر اپنی طرف سے حاشیہ چڑھائے۔ غرض کہ رند کے دل میں اس واقعہ کی وجہ سے بھی ایک کاوش موجود تھی۔ یہ بھی ان کے لئے نسیم سے بگڑنے کی وجہ ہوئی۔ ایک موقع پر رند نے ایک شعر پڑھا۔ ؎

کیا ملا عرض مدعا کر کے　　　　بات بھی کھوئی التجا کر کے

نسیم نے پہلا مصرع یوں بدل کر پڑھا۔ ع

فائدہ عرض مدعا کر کے

اور کہا اب شعر بہتر ہو گیا۔ اور لوگ بھی جو بیٹھے تھے انہوں نے بھی نسیم کی ایسی کہی۔ یہ امر بھی رند کو ناگوار گذرا۔

نسیم کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرہ میں تھی اس کا اندازہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرع امتحاناً بھیجے گئے کہ شاعران لکھنؤ ان پر مصرعے لگا کر بھیجیں۔ تینوں مصرعے ملاحظہ ہوں۔

(۱) ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

(۲) اسلئے قبر پہ رکھا انہیں زنجیر سمیت

(۳) من می روم بہ کعبہ دل میرود بدیر

اب اہل لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے کہہ کر بھیجے جائیں کہ دلی والوں کو بھی یہاں کی شاعری کا قائل ہونا پڑے۔ اگر مصرعے سست ہوئے تو ہو جائے گی۔ غرضکہ تین شخصوں کو جو ہر طرح اس کام کے لئے موزوں خیال کئے گئے ایک ایک مصرع پر مصرع لگانے کا کام سپرد ہوا پہلا مصرع ناسخ کو دیا گیا۔ دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو۔ گو کہ اس وقت

بڑے شاعر موجود تھے مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قائم رکھنے کا شرف نسیم ہی کو حاصل ہوا۔ تینوں استادوں نے جی توڑ کر مصرعے لگائے ہیں۔

ناسخ کا مصرع ہے۔

ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا (ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا)

آتش کا مصرع ہے۔

حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے (اسلئے قبر میں رکھا انہیں زنجیر سمیت)

نسیم کا مصرع بھی لاجواب ہے۔

دارم ز دین و کفر بہر یک قدم دو سیر من می روم بہ کعبہ و دل می رود بدیر

نسیم کے مزاج میں آزادی اور بےپروائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی دنیا کے مال و دولت کی تمنا نہ کی۔ گو کہ بہت اہل سخن اس زمانے میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز تھے اور دربار شاہی میں ان لوگوں کی رسائی تھی۔ ان حضرات نے کئی مرتبہ نسیم سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کو دربار شاہی تک پہونچا دیں اور ان کے منصب و جاگیر کی فکر کریں مگر اس شہنشاہ سخن نے دوات و قلم کو طبل و علم پر ترجیح دی اور دنیا کی شان و شوکت کی طرف رخ نہ کیا۔ اور یہ کیا اکثر اہل کمال اسی کے رنگ کی طبعیت رکھتے ہیں۔ انیس مرحوم فرماتے ہیں۔

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

ایک مرتبہ امجد علی شاہ کے سامنے ایک طوائف نے نسیم کی وہ لاجواب غزل گائی جسکا مطلع ہے۔

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

جب اس مرصع غزل کا مقطع گایا۔

جان نکل جائے گی تن سے اے نسیم　　گل کو بوئے گل ہوا تبلائے گی

تو سخن شناس بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ غزل اسی نسیم کی ہے جو گلزار نسیم کا مصنف ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ یہ سننا تھا کہ ارشاد ہوا کہ اِس سخنور باکمال کو دربار شاہی میں حاضر کرو۔ حریفوں نے کہا کہ حضور نسیم کا تو انتقال ہو گیا۔ خدا جانے وہ کیسا وقت تھا اور یہ منحوس کلمہ کیسی زبانوں سے نکلا تھا۔ اِدہر یہ بات منہ سے نکلی اُدہر قدر انداز قضا کے ترکش سے تیر نکلا جس نے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں نسیم کا خاتمہ کر دیا۔ مرنے کے دو تین گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا۔

پہونچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش رہے
جان پڑی، تب بار شکم تھے مر کے وبالِ دوش ہوے

ایک یادگار مشاعرہ

تیرہ چودہ سال کا عرصہ ہوا کہ لکھنو میں پنڈت للتا پرشاد صاحب وثیقہ دار کے یہاں ایک معرکہ آرا مشاعرہ ہوا تھا مصرع طرح یہ تھا۔

اگتی ہے جا بجا سبزہ کنگھی مرے چمن میں

لکھنو کے قریب قریب تمام اساتذہ جمع تھے لیکن جلال مرحوم نہیں تشریف لائے تھے۔ قریب ۸ بجے شام کے مشاعرہ شروع ہوا اور تقریباً دو بجے

شب کو ختم ہوا تمام اساتذہ نے اپنے اپنے رنگ میں پُرزور غزلیں کہی تھیں۔ اور پُرزور غزلیں کس طرح نہ ہوں۔ اس زمین میں آتش کی یادگار غزل کا نغمہ سب کے کانوں میں سمایا ہوا تھا۔ سبحان اللہ کیا کیا شعر فرمائے ہیں معلوم ہوتا ہے بزم خیال میں نور خداداد کی شمعیں روشن ہیں۔ میرے دوستو ذیل کے اشعار پر نظر ڈالو اور لکھنؤ کی روح پر دم دو پڑھو۔ ؎

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں — لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

دو روزہ ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دنیا — بوئے شب عروسی مہمان ہے پیرہن میں

بازار مصر میں چل یوسف کا سامنا کر — کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائیگا چلن میں

اک تختہ ہفت کشور دہلی کا ہے ہماری — نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نو رتن میں

آیا تھا بلبلوں کی تدبیر میں گلوں نے — ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

یادِ فقیر آگے اُس بت کے بولتا ہے — اک اک گرہ میں دو نگا زنار برہمن میں

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی — کیا کیا جلا ہے سا کھو پولا جو ڈھاک بن میں

آخری شعر تو ایسا ہے کہ اس کا جواب اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے۔ آتش کے بعد اساتذۂ قدیم میں اسیر مرحوم نے دو ایک شعر اس زمین میں خوب کہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تم رنگ ہو سخن میں تم پھول ہو چمن میں — تم روح ہو بدن میں تم شمع انجمن میں

گھر کر سحاب آیا نہروں میں آب آیا — دورِ شراب آیا مستو چلو چمن میں

آفت میں جان خستہ پائے امید بستہ — دل کشتیِ شکستہ دریائے موجزن میں

امیر و داغ کی بھی غزلیں اسی طرح میں موجود ہیں اور دونوں نے ایک ایک شعر خوب کہا ہے۔

داغ۔ کیا کیا کدورتیں ہیں اس داغ دار دل کی — آتی ہے خاک لینے آندھی اسی چمن میں

امیر۔ کیا جانے کہ مجھ پہ کیا ہو لوٹے گیا شگوفہ ۔ بلبل پکارتا ہے صیاد کو چمن میں

قدر بلگرامی کا بھی ایک شعر یاد آگیا۔ ؎

لب پر ہنسی جو آئی دنداں کھلے دہن میں ۔ چمکی یمن میں بجلی جا گری عدن میں

خیر۔ کجا بودم مرکب کجا تاختم۔ کہاں حال کا مشاعرہ کہاں آتش و اسیر لیکن زمین ایک ہی ہے گو کہ گلکاریاں مختلف ہیں۔ پس نگاہِ شوق کا ایک تختہ کی سیر کرتے ہوئے دوسرے تختہ کی جانب بھٹک جانا قابلِ معافی ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت مشاعرہ مذکور کی تمام غزلیں موجود نہیں جو کچھ قلیل سرمایہ اشعار کا حافظہ کی امانت میں موجود ہے۔ اسے قلم کاغذ کے سپرد کرتا ہوں۔ آرزومند دل لطف اٹھائیں اور داد دیں۔ میر رضا حسین شہا لکھنؤ کے ایک پرانے شاعر تھے۔ میر وزیر علی صبا کے داماد تھے اور شاگرد بھی۔ ان کو فخر تھا کہ آتش کے رنگ میں کہنے والا ان کے سوائے کوئی نہ تھا۔ آدمی کم استعداد تھے مگر قدیم اساتذہ کے فیضانِ صحبت نے زبان کو صاف اور طبیعت کو براق کر دیا تھا۔ انہوں نے اس مشاعرہ میں جو غزل پڑھی تھی اس کے چند شعر لکھتا ہوں۔ ؎

فصلِ خزاں کے آتے کیسی ہوا چلی یہ ۔ شمع مرادِ بلبل گل ہو گئی چمن میں

پہونچی یہاں تلک ہے اب لاغری ہماری ۔ بنتی ہیں دو قبائیں مجنوں کے پیرہن میں

آتش کی یہ زمیں ہے جل جائینگی زبانیں ۔ آہو نہ چر سکیں گے اس شیر بر کے بن میں

آغا مظہر صاحب مظہر ایک آزاد اور رنگین مزاج بزرگ تھے۔ ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی اور زبان ظرافت کے چٹخارے سے کامیاب تھی۔ ان کی استعداد علمی معقول تھی اور مضمون آفرینی کی طرف طبیعت خاص طور سے مائل تھی۔ غالب کے بڑے مداح تھے اور جدت کے عاشق تھے۔ اکثر کہا کرتے

تھے کہ جو شعر کہتا ہوں اسے اپنا کر لیتا ہوں۔ اس زمین میں بھی اچھے اچھے شعر کہے تھے۔ دو تین شعر یاد رہ گئے۔

کیوں ہن ہے اور بچے یوں عشق سے چمن میں | منقار بلبلوں کی غنچوں کے ہے دہن میں
اُسکو اُٹے عطر کھینچا گلہائے داغ دل کا | تسخیر شمس شبنم کرتی ہے اس چمن میں
نازونیاز دیکھیں بلبل کے اور گل کے | ہم بھی چلیں چمن میں تم بھی چلو چمن میں

سید غضنفر علی خاں صاحب حکیم منشی اسیر کے بڑے صاحبزادے لکھنؤ کے گراں مایہ شاعروں میں تصور کئے جاتے تھے۔ عربی و فارسی کی استعداد کمال تک پہونچی ہوئی تھی اور علم عروض کے زبردست ماہر تھے۔ مضمون آفرینی اور جدت پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنے نامور باپ اسیر مرحوم کی مشکل پسندی کے رنگ کو بھی ذرا آنچ کر دیا تھا۔ غزل میں بھرتی کا ایک شعر پڑھنا ان کیلئے کسر شان تھا۔ اپنے نزدیک وہ ہر ایک شعر میں کوئی نہ کوئی جدت اور استادی کا پہلو رکھتے تھے۔ اب یہ کہ اس کوشش میں کامیابی کہاں تک ہوتی تھی اس کا انصاف قدر دانوں تک تھا۔ عموماً ان کے اشعار سادگی کے جوہر سے معرا ہوتے تھے اور اکثر مغلق ہوتے تھے لیکن ان کا کلام دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک استاد جید کا کلام ہے جو شعر صاف نکل جاتا تھا وہ قیامت کرتا تھا۔ مشاعروں کی طرح یہ وہ غزل بہت کم کہتے تھے۔ کیونکہ شاعری کا منصب مقدمہ بازی نے چھین لیا تھا لیکن اس مشاعرہ کے لئے انہوں نے بھی غزل کہی تھی اور خوب کہی تھی۔ چند اشعار جو اس وقت یاد ہیں ہدیہ ناظرین ہیں۔

پھر غیر غیر ہی ہے گو ہے اس انجمن میں | بیگانگی سبزہ جاتی نہیں چمن میں
چھڑکا نمک سی جا سے سفید نے بھی | زخم غم جوانی بس جس جگہ تھے تن میں
بھاگے عدو کو کب صاحبانِ دولت | دزدِ کفن کی نیت لپٹی رہی کفن میں

فصلِ بہار کتنی باتیں کریگی تم سے — ہے یاد کی گرہ وہ غنچہ ہے جو چمن میں
بلبل نے شہر جو کھلا گل نے دکھائی آنکھیں — کس سرکشی پہ سبزہ دب کر رہا چمن میں
نالوں سے بلبلوں کے گل تنگ آکے بولے — یا یہ رہیں چمن میں یا ہم رہیں چمن میں

نواب یوسف حسین خاں صاحب یوسف شرفاء لکھنؤ میں سے تھے اور قدیم تہذیب کے جو جوہر اور اوصاف ہونا چاہئیں وہ ان میں سب موجود تھے ان کی زیارت کرنے سے روح کو بالیدگی حاصل ہوتی تھی۔ شاعری میں منشی امیر کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کو ہمیشہ محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی شاعری کے رنگ اور امیر کے رنگ سخن میں اندھیرے اجالے کا فرق نظر آتا تھا۔ زبان آب کوثر میں دھوئی ہوئی بندشیں نورانی اور پاکیزہ شعر کیا ہوتا تھا گویا نور کا دریا بہتا نظر آتا تھا۔ پڑھنے کا یہ عالم تھا کہ جس مضمون کا شعر پڑھتے تھے اس کی تصویر محض آواز کے اتار چڑھاؤ اور آنکھ کی گردش سے کھینچ دیتے تھے۔ معمولی سا شعر بھی ان کی زبان سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ میرے خیال میں ان کی زبان خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی اور شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ فصاحت ان کے لئے پیدا ہوئی تھی اور وہ فصاحت کے لئے۔ ؎

اللہ رے صفائے بیان حدیث دوست — دم بند ہے فصاحتِ اہل حجاز کا

انہوں نے جو غزل مشاعرہ کے لئے فرمائی تھی اس کا رنگ تمام غزلوں سے جداگانہ تھا اور خاص ان کے مذاق سخن کا نشان دیتی تھی۔ چند اشعار لکھتا ہوں ؎

بوتل کے کاگ اڑ کر بہکی ہے مے چمن میں — ٹوپی اچھل رہی ہے مستوں کی انجمن میں
ساغر بھرے دھرے ہیں ساقی کی انجمن میں — ہاتھوں اچھل رہا ہے بلبل کا دل چمن میں
صیاد کا ہو دم بھر کہ پھولوں کی انجمن میں — حسرت بھری نگاہیں نرگس کی ہیں چمن میں

کس نے لیا کہ بیٹھو پھولوں کی انجمن میں
حسرت بھری نگاہیں نرگس کی ہیں چمن میں

پتوں سے نخل گلشن نسک جو دیتے ہیں
چوری گیا ہے شاید بلبل کا دل چمن میں

وہ کونسا حسین ہے تم پر نہیں جو مرتا
بھرتا ہے حسن یوسف پانی چہ ذقن میں

مرنے کے بعد ایسے ہم کچھ ہوئے تبرک
بوسیدگی نے چوما ہر استخوان کفن میں

ہر رنگ کے گلوں نے ڈالا جو عکس یوسف
طاؤس بن گئی ہے باد صبا چمن میں

مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب یوسف حسین خاں صاحب نے یہ شعر پڑھا کہ ؎
مرنے کے بعد ایسے الخ

تو حکیم صاحب نے بہت تعریف کی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ شعر خاص ان کے رنگ کا تھا مگر باوجود اسکے حضرت یوسف کی زبان کی جلا اس میں بھی موجود ہے۔

پنڈت بشن نراین صاحب ڈر کی ابتدائی شاعری کا یہ زمانہ تھا۔ انکا بھی ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

گل کے جو کان اڑائے تک ایک ے بلبلوں نے
بولی کلی چٹک کر کیا شور ہے چمن میں

ایک پرانی وضع کے بزرگ موجود تھے اور غالباً منشی اسیر مرحوم کے شاگرد تھے انہوں نے ایک رنگ قدیم کا شعر کہا تھا۔ ؎

دریائے خون عاشق لہریں جو لے رہا ہے
بنتا ہے مچھلیاں ہیں بازو رے تیغ زن میں

مگر جو شعر حاصل مشاعرہ ثابت ہوا اور جس کی دھوم دوسرے روز تمام شہر میں ہوگئی وہ شعر حضرت بدر کا تھا۔ حضرت بدر کا نام مجھے اسوقت یاد نہیں۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جناب حکیم کے شاگرد تھے۔ اور لکھنؤ کے پرانے نواب زادوں میں تھے اور دولت کثیر رکھتے تھے۔ شعر بھی تفنن طبع کے طور پر کہہ لیا کرتے تھے۔ اس مشاعرہ میں انہوں نے یہ شعر پڑھ کر قیامت کردی۔ ؎

دامن کو چاک کرکے رسوا ہوئی ہر کیا کیا
تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

اس شعر کے علاوہ تمام غزل پھیکی ہے۔ اور شعر کا مضمون بھی آتش کے ایک شعر سے لڑتا نظر آتا ہے۔ ؎

نہ پھاڑنا تھا زلیخا کو دامنِ یوسف
یہ اس کا پردۂ عصمت دریدہ ہونا تھا

لیکن حق یہ ہے کہ بدر کا شعر صفائی بندش کے لحاظ سے آتش کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے اور یہی اس کے مقبول ہونے کا باعث ہے۔

نواب ہادی علی خاں یکتا ایک آزاد منش بزرگ ہیں۔ غزل کم کہتے ہیں لیکن تخمیس کے بادشاہ ہیں۔ اور اس رنگ میں ان کا جواب لکھنؤ میں نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے تخلص یکتا رکھا ہے۔ اس مشاعرے میں آتش کی غزل پر انہوں نے مصرع لگائے تھے۔ جو کچھ یاد ہے لکھتا ہوں۔ ؎

"تو من شدی" کا غل ہے ہر سو ہر ایک بن میں
"من تو شدم" رچا ہے فرہاد کو ہکن میں
یہ اتفاق باہم کمتر ہے مرد و زن میں
شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

سامان ظاہری ہے یہ اختلاطِ دنیا
کس پھیر میں پڑا ہے چھوڑا رتباطِ دنیا
جب ایک دن فنا ہے پھر کیا بساطِ دنیا
دو روز ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دنیا
بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں

مشاعرے کے بعد حضرت یکتا ایک روز ملے اور حضرت بدر کے شعر پر جو مصرع لگائے تھے وہ سنائے۔ وہ بھی لکھتا ہوں۔

عاشق ہوئی ہے کیا کیا شیدا ہوئی ہے کیا کیا
بیدل ہوئی ہے کیا کیا جویا ہوئی ہے کیا کیا
دریدہ یہ قیامت برپا ہوئی ہے کیا کیا
دامن کو چاک کرکے رسوا ہوئی ہے کیسا کیا
تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

علاوہ ان حضرات کے جن کے اشعار میں نے لکھے ہیں بہت سے شعر جمع تھے اور غزلیں بھی پڑھی تھیں مگر مجھے اس قدر اشعار یاد رہ گئے۔ اب تک میری نگاہوں کے سامنے اس مشاعرے کی تصویر ہے۔ کم سے کم ڈیڑھ سو حضرات نے غزلیں پڑھی تھیں جس میں اساتذہ بھی تھے۔ شاعر بھی تھے، خوشگو بھی تھے اور محض تخلص کے گنہگار بھی تھے۔ اور سامعین کی تعداد دو سو تین سو سے کم نہ تھی۔ جب اچھا شعر پڑھا جاتا تھا تو قدر دانوں کی تعریف اور واہ واہ کے نعروں سے یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ چھت اڑ جائے گی۔ ایک طرف مظہر مرحوم کے چٹکلے روتے کو ہنساتے تھے۔ دوسری جانب جناب حکیم مرحوم کی مولویانہ اور ادب آمیز ظرافت اپنے رنگ میں مزہ دے جاتی تھی۔ نواب یوسف حسین خاں کی نورانی صورت سے تمام محفل نورانی ہو رہی تھی۔ ہادی علی خاں صاحب یکتاؔ کا انداز تعریف قیامت تک نہ بھولیگا۔ افسوس ہے تو یہ ہے کہ اب یہ رنگ دیکھنا نہ نصیب ہوگا۔ پانچ چھ سال کا عرصہ ہوا جناب حکیم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضرت مظہر کے مرنے سے بزم احباب سونی ہو گئی۔ نواب بنے صاحب مشتاق بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ مگر غزل طرح پر نہیں پڑھی تھی۔ موت نے جوانی ہی کے عالم میں ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ایک نواب یوسف حسین خاں باقی رہے تھے افسوس ہے کہ پارسال طاعون کی ہوا سے وہ چراغ بھی گل ہو گیا۔ جناب جلالؔ کا زخم ابھی تازہ ہے۔ ؎

اٹھ گئیں ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

اب مشاعرے ہوں تو کیوں کر ہوں۔ خیر خدا عزیز و تعمر کو سلامت رکھے کہ انہوں نے مشاعروں سے علمی مذاق کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ ورنہ

زمانہ حال کے نوجوانوں کی طبیعتیں تمام سنجیدہ مشاغل سے پھری ہوئی ہیں۔ اسی میں شعر و سخن کے مذاق کا خون بھی شامل ہے۔ رہتا کھینچنا۔ ہاکی یعنی ولایتی گلی ڈنڈا کھیلنا۔ ٹینس کے دام میں اسیر رہنا اب تہذیب و شائستگی کا معراج خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن عقیدتمند دل مشاعرے کے بدلے مشاعرے کی یاد ہی سے طبعیت کو تازہ کر لیتے ہیں ورنہ یہ چمن اب کہاں۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

اودھ پنچ

ہندوستان کے جس جس گوشہ میں اردو زبان کا نغمہ سنائی دیتا ہے وہاں شاید کوئی ایسا شخص ہو کہ جس کے کان "اودھ پنچ" مرحوم کے ذکرِ خیر سے آشنا نہ ہوں۔ "اودھ پنچ" نے تیس پینتیس سال تک اپنی عالمگیر شہرت و وقار کے پردے میں اخباروں کی دنیا میں سلطنت کی ہے اور اس کی پرانی جلدوں کے گورغریباں میں اکثر ایسے اہلِ کمال دفن ہیں جن کے قلم کی دھاک دلوں میں لرزہ پیدا کرنے کیلئے کافی تھی۔

جس وقت "اودھ پنچ" نے دنیا میں جنم لیا اُس وقت اخبار نویسی کا فن ہندوستان میں تخمیناً چالیس سال کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ ۱۸۳۶ء میں پہلے پہل سرکار کی جانب سے ہندوستان کی بے زبان

رعایا کو اخبار نکالنے کی نعمت عطا ہوئی اور ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" نے زبان اور ظرافت کے چہرے سے نقاب اٹھائی۔ اس چالیس سال کے عرصہ میں اُردو کے بہت سے اخبار جاری ہو چکے تھے۔ مثلاً لاہور میں "اخبار عام" اور "کوہ نور" کا دور تھا۔ یہ اپنے وقت کے نامور اخبار تھے۔ دہلی سے "اشرف الاخبار" کی آواز سنائی دیتی تھی۔ "وکٹوریہ پیپر" سیالکوٹ سے جاری تھا۔ "کشف الاخبار" بمبئی میں اور "جریدۂ روزگار" مدراس میں اردو کا نقارہ بجا رہا تھا۔ "کارنامہ" اور "اودھ اخبار" لکھنؤ سے شایع ہوتے تھے۔ عرصہ ہوا کہ "کارنامہ" کا کام تمام ہو گیا۔ "اودھ اخبار" ابھی تک اپنے بڑھاپے کی شرم رکھے ہوئے ہے مگر اس کا جو رنگ اب ہے وہی جب تھا۔ ان کے علاوہ "اودھ پنچ" کی اشاعت کے قبل بہت سے اردو اخبار اپنی پیدائش اور موت کی منزلیں طے کر چکے تھے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ اخبار محض خبروں کی تجارت کرتے تھے۔ بجز "لارنس گزٹ" کے جو کہ میرٹھ سے شایع ہوتا تھا اور جس کی نظر رعایا کے حقوق پر رہتی تھی۔ عام طور سے ان اخباروں کا نہ کوئی خاص پولٹیکل یا سوشل مسلک تھا نہ یہ کسی دستور العمل کے پابند تھے۔ اردو اخبار نویسی کی تاریخ میں "اودھ پنچ" اور "ہندوستانی" پہلے دو اخبار ہیں جنہوں نے اخبار کو محض تجارت کا ذریعہ نہ سمجھا بلکہ مغربی اصولوں پر اخبار نویسی کی شان پیدا کی اور اپنا خاص مسلک قائم کیا۔ "ہندوستانی" کا دور "اودھ پنچ" کے چھ سال بعد شروع ہوا اور جس پولٹیکل رشی کے دماغ کا یہ اخبار کرشمہ تھا اس نے اسے بھی اپنی ذات کی طرح پولٹیکل خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اودھ پنچ گو کہ ظرافت کا پرچہ تھا، مگر پولٹیکل اور سوشل معرکہ آرائیوں سے بے خبر نہ تھا۔ اس کا مستقل سوشل اور پولٹیکل

ان اخباروں [illegible]

مسلک تھا۔ اس صوبے میں "ہندوستانی" کانگریس کا چراغ سمجھا جاتا تھا مگر جن گوشوں میں اس چراغ کی روشنی کا گذر نہ تھا وہاں "اودھ پنچ" کی بجلی چکاچوند پیدا کرتی تھی۔ سوشل اصلاح کے معاملہ میں اودھ پنچ لکیر کا فقیر تھا۔ نئی روشنی کے نادان دوستوں کی حماقت کا پردہ فاش کرنے کے علاوہ اس کی ذات سے اس تحریک کو کوئی نفع نہیں پہونچا۔ ظرافت کے اعتبار سے یہ اپنے رنگ کا پہلا پرچہ تھا۔ اکثر ظریفانہ اخبار مثلاً "انڈین پنچ" "بمبئی پنچ" "بانکی پور پنچ" وغیرہ اس کی تقلید میں نکلے مگر وہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کر ختم ہو گئے۔ زمانہ سے کسی کو شہرت و ناموری کی سند نہیں ملی۔ اودھ پنچ کا جادو اردو زبان پر عرصے تک چلتا رہا اور اس طولانی زمانہ میں جو خدمات اودھ پنچ سے ظہور میں آئیں ان پر نظر ڈالنے سے اُردو نویسی کے دربار میں ہم اس کا صحیح مرتبہ قائم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور عام طور سے لوگ اس کے فقروں اور لطیفوں پر لوٹ رہتے تھے۔ جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی مگر قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے اس کو دیکھتے ہوے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو بہ حیثیت مجموعی اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اُردو زبان کے عاشق کو غالب کے خطوں پر نظر ڈالنا چاہیے۔ اردو نثر کے ان جواہرات میں جہاں اور بہت سی لطافت و رنگینی کے جوہر موجود ہیں۔ وہاں ظرافت کی جھلک بھی کم دلکش نہیں ہے۔ نہ پھبتیاں ہیں نہ طعن و تشنیع کے جگرخراش فقرے ہیں محض روزمرہ کی باتیں ہیں۔ مگر طبیعت کی شوخی و متین

الفاظ کے پردے سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کے چہرہ پر مسکراہٹ کا نور پیدا کر دیتی ہے۔ باریک اور لطیف مذاق کی رنگینی اور بے ساختہ پن پر جس قدر غور کرو اتنا ہی زیادہ لطف آتا ہے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے ان کے قلم سے پھبتیاں اس طرح نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر۔ جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے وہ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بیکسی پر ہنستے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسرے کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اکثر طبیعت کی شوخی اور بے تکلفی درجۂ اعتدال سے گذر جاتی ہے اور ان کے قلم سے بے تحاشا ایسے فقرے نکل جاتے ہیں جن کو دیکھ کر مذاق سلیم کو آنکھیں بند کر لینا پڑتی ہیں۔ ایسا ہونا معیوب ضرور ہے مگر ایک حد تک قابل معافی ہے۔ اودھ پنچ کے ظریف اس زمانے کی ہوا کھائے ہوئے تھے۔ جب مذاق وہ بے تکلفی کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع تھا اور زبان و قلم کی بہت سی بے اعتدالیاں ہماری نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ اب زمانہ کے ساتھ ظرافت کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ اور یہی دنیا کا دستور ہے۔ ممکن ہے کہ جن باتوں کو ہم آج پھول سمجھتے ہیں وہ آئندہ نسلوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں۔ ظرافت کے رنگ سے قطع نظر کر کے اودھ پنچ کی یادگار خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس کا مصنوعی زیور اتار کر جس میں سوائے کاغذی پھولوں کے کچھ نہ تھا۔ ایسے پھولوں سے آراستہ کیا۔ جن میں قدرتی لطافت کا رنگ موجود تھا۔ اودھ پنچ

کے پہلے رجب علی سرور کے طرز تحریر کی پرستش ہوتی تھی اور عام مذاق تصنع وبناوٹ کی طرف مائل تھا۔ اس زمانے میں جو اردو اخبار جاری تھے ان کی زبان ایسی ہوتی تھی جسے ہم محض محبت سے اردو کہہ سکتے ہیں۔ آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ علاوہ منشی سجاد حسین مرحوم کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ معروف بہ ستم ظریف۔ حضرت احمد علی صاحب شوق۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ نواب سید محمد آزاد۔ بابو جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی کسمنڈوی۔ حضرت اکبر حسین صاحب اکبر یادگار نام ہیں۔ ان لوگوں کے نظم و نثر کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک طرز نو کے موجد ہی نہیں ہیں بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہیں۔ انکی عبارت شوخی و تازگی اور خداداد بے تکلفی سے معمور ہے۔ اور ان کی زبان لکھنو کی بول چال اور محاورے کی صفائی کے اعتبار سے ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلے میں چوکھا ہے۔ احمد علی صاحب شوق کے مضامین میں ظرافت کی شگوفہ کاری کے علاوہ زبان و محاورے کی تحقیقات کا خاص لطف ہے۔ حضرت کسمنڈوی مرحوم کی عبارت خاص طور سے دلکش ہے مگر فارسیت کا رنگ زیادہ ہے۔ ہجر کا رنگ خاص یہ ہے کہ ان کی ظرافت بمقابلہ اوروں کے بدمذاقی اور طعن و تشنیع کے کانٹوں سے پاک ہے۔ برق کی عبارت میں ظرافت کا چٹخارہ بہت کم ہے۔ مگر زبان نہایت صاف اور ستھری ہے۔ آزاد کا قلم نوابزادوں کی بےفکری و عیش پسندی کا خاکہ کھینچنے میں مشاق ہے۔ منشی سجاد حسین کا طرز تحریر سب سے الگ ہے۔ مضمون کیا ہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے ذخیرے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا

مصنف سے گفتگو کر رہا ہے۔ عبارت کہیں کہیں مختلف علوم و فنون کے پیچیدہ استعاروں سے گراں بار نظر آتی ہے مگر بیان کی تازگی کی وجہ سے پڑھنے والے کا جی نہیں گھبراتا۔ ظریفانہ نظم کے میدان میں حضرت اکبر سب سے دس قدم آگے ہیں۔ طبیعت کی خداداد شوخی اکثر زبان کی صفائی سے بازی لیجاتی ہے مگر عموماً سوشل پولٹیکل اور مذہبی مسائل کے ظرافت آمیز پہلو جس خوبی کے ساتھ حضرت اکبر نے نظم کئے ہیں وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ ان کا معیار ظرافت بھی اوروں کے مقابلہ میں لطیف تر ہے۔ اودھ پنچ کی محفل انہیں پر مذاق اور نورانی طبیعتوں سے آراستہ تھی اور اب بھی اگر کوئی شخص اُردو زبان حاصل کرنا چاہے تو اودھ پنچ کے ٹوٹے کھنڈروں کی زیارت اس کے لئے ضروری ہے۔ اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی پر مذاق اور دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرم، چہلم عید، شب برات، ہولی، دوالی، بسنت کے جلسے، عیش باغ کے میلے، رقص و سرود کی محفلیں، مشاعرے، عدالت کی روبکاریاں، مرغ بازی، بٹیر بازی کے ہنگامے۔ الکشن کے معرکے ایسے مشغلے تھے جو ہمیشہ اودھ پنچ کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے اور ان کی طبیعتوں کے لئے تازیانہ کا کام دیتے تھے ساقی نامے، برہے، بارہ ماسے، دوہے، ٹھمریاں، غزلیں، رباعیاں وغیرہ نظم کرنے میں اس کے اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین ہر ہفتہ ایک چھوٹا سا مضمون لوکل علیہ الرحمہ کے عنوان سے لکھتے تھے جس میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں کہ پڑھنے

والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔

زندہ دلی کی یہ تمام تصویریں اودھ پنچ کے بوسیدہ مرقع میں موجود ہیں۔ گلدستہ پنچ کی دو جلدوں میں ان کا پورا نقشہ اتارنا اتنا ہی مشکل ہے جیسے کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ مگر زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے جو کچھ ہو سکا اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے علاوہ اودھ پنچ میں شاعری اور صحت زبان کے متعلق اکثر ایسے زبردست مباحثے چھیڑے جو مہینوں اور برسوں تک قائم رہے اور جن کی وجہ سے اردو دان سوسائٹی میں عرصہ تک چہل پہل رہی۔

پہلے معرکہ کا تعلق "فسانہ آزاد" سے ہے۔ سرشار مرحوم ابتدا میں اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے اور اس کے گہوارے کے گرد بیٹھنے والوں میں تھے۔ جس رنگ کا اودھ پنچ عاشق تھا اسی رنگ میں وہ بھی ڈوبے ہوئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ زمانے کے جس انقلاب نے دنیا کو اودھ پنچ کی صورت دکھائی اسی نے سرشار کی طبیعت کو بھی پیدا کیا۔ اودھ پنچ کے ایک سال بعد فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اودھ اخبار کے اڈیٹر ہونیکی وجہ سے سرشار نے یہ سلسلہ اسی اخبار میں شروع کیا ورنہ فسانہ آزاد کا دریا بھی اودھ پنچ ہی کے چشمہ سے جاری ہوتا کیونکہ دونوں کا مذاق تحریر یکساں ہے اور دونوں ایک ہی باغ کے دو پھول معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اودھ پنچ نے اودھ اخبار کو بتیا اخبار خطاب دے رکھا تھا اور اس کے حال پر اودھ پنچ کے ظریفوں کی خاص عنایت تھی۔ جب سرشار اودھ اخبار کے اڈیٹر ہوئے تو کچھ روز تک نوک جھونک مراسم

کا پردہ قائم رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ طرفین سے طبیعتیں بے قابو ہوتی گئیں اور آخر کار فسانہ آزاد پر اعتراضات شایع ہونے لگے۔ اودھ پنچ کا فسانہ آزاد پر خاص اعتراض یہ تھا کہ جو بیگمات کی زبان اس میں لکھی گئی ہے وہ محلات کی زبان نہیں ہے بلکہ ماماؤں اور مغلانیوں کی زبان ہے۔ اس قسم کے اعتراضات کے دونگڑے عرصہ تک اودھ پنچ کے بادلوں سے برسا کئے اور ظرافت کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ ان اعتراضات کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ضرور درست ہیں۔ مگر زیادہ تر طباعی پر مبنی ہیں۔

اودھ پنچ کا دوسرا وار مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ مولانا موصوف کے دیوان کے مقدمہ میں شاعری کے اصلی مفہوم پر بحث کی گئی ہے۔ جب یہ مقدمہ شایع ہوا تو اس بحث نے اودھ پنچ کی بارود کے لئے چنگاری کا کام کیا۔ اودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکایتیں تھیں۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے۔ جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطرتی شاعری کی لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔ اختلاف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حالی نے اپنے مقدمہ میں مصنوعی اور خلاف فطرت شاعری کی جس قدر مثالیں دی تھیں ان کا کثیر حصہ لکھنؤ کے شعرا کے کلام سے لیا تھا۔ جس کا لازمی منشا اودھ پنچ کے نزدیک یہ تھا کہ لکھنؤ کے شعرا کی توہین ہو۔ ان خیالات کا دلوں میں امنڈنا تھا کہ دیوان اور مقدمہ کے ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہو گئی اور یہ سلسلہ بھی مدت تک جاری رہا۔ جس عنوان سے اودھ پنچ کے شہسواروں نے پانی پت[1] کے

---

[1] اودھ پنچ میں کلام حالی پر جو اعتراضات کا سلسلہ جاری تھا اس کے عنوان میں یہ شعر مولانا حالی کے وطن کی مناسبت سے لکھا جاتا تھا۔ ؎ ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

میدان میں طرارے بھرے ہیں وہ بعض صورتوں میں قابل اعتراض ضرور ہے مگر نفس مضمون کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑیگا کہ اودھ پنچ کی شکایت بے بنیاد نہ تھی تیسرے ہنگامے کی رونق داغ کی شاعری سے ہے۔ اودھ پنچ نے داغ کی شاعرانہ عظمت کبھی تسلیم نہیں کی۔ اس کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اودھ پنچ کے ظریفوں کے دل میں لکھنو اور دہلی کی رقابت کا زخم ہرا تھا۔ اور دوسرے جانب داغ کے شاگرد اپنے استاد کی شاعری پر تمام لکھنو کو قربان کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاگردوں کی بدمذاقی کا خمیازہ غریب استاد کو اٹھانا پڑا اور اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں عرصہ تک اڑا کیں جن کا رخ داغ کی شاعری کے علاوہ اسکے حسب و نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانہ تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزار نسیم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لکھنو کے مشہور فسانہ نویس مولانا شرر نے گلزار نسیم کی زبان اور شاعری پر اعتراض شائع کئے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے۔ نسیم کا نام محض فرضی ہے۔ اودھ پنچ نے اپنی پرانی وضع کے مطابق ان اعتراضات کا خاکہ اڑایا اور سب سے بڑی گرفت یہ کی کہ اگر یہ مثنوی آتش کی تصنیف ہے تو اس میں زبان اور محاورے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرر نے اس اشارے کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں جوش پر آگئیں اور اودھ پنچ کی جھنجھلائی ہوئی

آگ کچھ ایسی بھڑک اٹھی کہ اس کی آنچ دور دور تک پہونچی۔ گلزار نسیم کا قصہ تو در کنار رہا۔ مولانا شرر کی زبان دانی اور نثر نگاری پر اعتراضات شائع ہونے لگے اور عرصہ تک نظم و نثر کی پھلجھڑیاں چھوٹا کیں۔ یہ سلسلہ بھی سال بھر بعد ختم ہوا۔ اس بحث کے غیر لطیف فقرے کے علاوہ نفس مضمون کے متعلق جو مضامین نکلے ان میں اکثر زبان و محاورے کی تحقیقات کا خاص لطف موجود ہے۔ ان مباحثوں کے علاوہ اکثر دوسرے اخباروں سے بھی اودھ پنچ سے نوک جھونک ہوتی رہی۔ ان میں اودھ اخبار، اور طوطی ہند پر اس کی خاص توجہ رہی۔ زبان و شاعری کی اصلاح کے علاوہ اودھ پنچ کی پولٹیکل خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ اودھ پنچ ابتدا سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگرس کے پہلے جو پولٹیکل معرکہ آرائیاں پیش آئیں۔ ان میں اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا۔ الحاق اودھ انکم ٹیکس البرٹ بل وغیرہ کے متعلق اکثر ایسے مضامین لکھے جن کا آج شائع کرنا موجودہ قوانین کے جکڑ بند کو دیکھتے ہوئے مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف معلوم ہوتا ہے اس نے والیان ریاست کی خوشامد سے اپنا دامن پاک رکھا اور ہمیشہ ان کی غفلت و عیش پسندی کا پردہ فاش کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی قومی محبت کے وسیع دائرے میں ہندو مسلمان سب شامل تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں کی آمد کی خوشی میں اودھ پنچ عید اور شب برات کے استقبال سے کم سرگرمی نہیں ظاہر کرتا تھا۔ ہولی اور بسنت کے زمانے میں اس کا پرچہ سرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شایع ہوتا تھا اور رنگین مزاج نامہ نگاروں کے ساقی نامے اور ترانے وغیرہ ہفتوں تک چھپا کرتے تھے۔ اودھ پنچ ہندو مسلمانوں کے قومی اتفاق کا ہمیشہ سے معین تھا اور اگر دونوں

قوموں میں کوئی نزاعی امر پیش ہوتا تھا تو اسے ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس چونکہ قومی اتفاق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ لہذا یہ بھی اس پولٹیکل تحریک کا دل و جان سے مددگار رہا۔ اس صوبہ میں منشی سجاد حسین مرحوم کانگرس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جن کے دیکھنے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے۔ منشی صاحب موصوف آخر دم تک اپنی وضع پر قائم رہے۔ ابتدا میں جب سر سید مرحوم نے اپنی زبان و قلم کے جادو سے اہل اسلام کا دل کانگرس کی طرف سے پھیر دیا تھا اس وقت سوائے اودھ پنچ کے کوئی اسلامی اخبار ایسا نہ تھا جو علی گڈھ کے پولٹیکل پیمبر کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔ ۱۸۸۸ء میں جب سر آکلنڈ کالون سر سید مرحوم اور مغفرت کے گنہگار راجہ شیو پرشاد کانگرس کا طبقہ الٹنے کی فکر میں تھے اسوقت "ہندوستانی" کے مضامین اور پنڈت اجودھیا ناتھ مرحوم کی دھواں دھار تقریروں کے علاوہ اودھ پنچ کی شمشیر برہنہ اس قومی تحریک کی تائید میں اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں جب کانگرس کا اجلاس لکھنؤ میں ہونیوالا تھا تو شہر کے چند سن رسیدہ بزرگوں نے اس کی مخالفت کا غلغلہ بلند کیا۔ اس مخالفت کی تردید میں ہندوستانی اور ایڈووکیٹ میں پند و نصائح کے دفتر کھل گئے لیکن ان واعظانہ فہمائشوں کے مقابلے میں وہ مضمون زیادہ کارگر ہوا جو اودھ پنچ میں "انڈے بچے والی چیل چلبھاز" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اکثر مزاج ایسے ہوتے ہیں جو بحث و منطق کے کڑوے گھونٹ نہیں قبول کرتے ہیں مگر ظرافت کی چاشنی سے راہ راست پر آجاتے ہیں۔ اس صوبہ کے پولٹیکل بحث و تحریک میں اس خدمت کا انجام دینے والا اودھ پنچ تھا۔ مذہبی اور قومی رسم و رواج کی

اصلاح کے بارے میں اودھ پنچ کا طریقہ زمانہ شناسی کی رفتار سے الگ تھا۔ اس نے محض علی گڑھ کے پولٹیکل مسلک کی مخالفت نہیں کی بلکہ سر سید مرحوم کے نورانی دماغ سے جو مذہبی اصلاح کی شعاعیں نکلیں ان پر خاک ڈالنے کی کوشش کی۔ علی گڈھ کالج کو لا مذہبی کا مرکز قرار دیکر اس کے بانی کو "پیر نیچر" کا خطاب دیا۔ اور "نیچریہ مذہب" کا مضحکہ اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اسی طرح پردے کی اصلاح اور تعلیم نسوان وغیرہ کے متعلق جو تحریک اہل اسلام میں مغربی تہذیب کے اثر سے پیدا ہو گئی تھی اسکی بھی سخت مخالفت کی۔ پردہ کی رسم کی تائید میں حضرت اکبر کا ذیل کا قطعہ زبان زد عام ہے۔ ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں | اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا | کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اسے پڑھ کر اصلاح پسند لوگ اپنے دانت پیسا کریں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس سے زیادہ لطیف ظرافت کا نمونہ اودھ پنچ میں مشکل سے ملیگا۔ کاشکے یہ خداداد جوہر اصلاح و رفاہ کی کوشش میں صرف ہوتا۔

اودھ پنچ کی ترقی و وقعت کا راز بہت کچھ اس کے ایڈیٹر کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ منشی سجاد حسین کا مزاج عجیب صفات کا مجموعہ تھا فطری ذہانت اور طباعی کے علاوہ زندہ دلی ان کی گھٹی میں پڑی تھی مصیبت و تکلیف کے زمانے میں بھی کبھی کسی نے ان کے چہرے پر سوائے مسکراہٹ کے افسردگی کی شکن نہ دیکھی۔ بیماری کے زمانے میں اگر کوئی مزاج پوچھتا تھا تو کہتے تھے زندگی کا عارضہ ہے اور اپنی تکلیفوں کا حال اس طرح بیان کرتے تھے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی تھی۔ دوا علاج سے مایوس ہو چکے تھے

مگر کہتے تھے کہ یہ سلسلہ محض اس لئے جاری رکھا ہے کہ باضابطہ موت ہو۔ بلا علاج مرنے کو بے ضابطہ مرنا کہتے تھے۔ اس زندہ دلی کے ساتھ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور رہتے تھے۔ دنیا کے ناہموار و تاریک پہلو اُن کی نگاہوں میں خود بخود کھٹکنے لگتے تھے اور ان کی پر مذاق طبیعت کو بلا لحاظ قوم و ملت بیتاب کر دیتے تھے۔ غیر کا ذکر نہیں ان کے دلی دوستوں اور عزیزوں کو اکثر ان کی بذلہ سنجی کا مزہ چکھنا پڑا ہے۔ دوستوں کی محبت اور قدر شناسی کی بدولت انھیں ابتدا ہی میں اتنے ذہین اور طباع نامہ نگار مل گئے جو ایک وقت میں شاید کسی دوسرے اخبار کو کم نصیب ہوئے ہونگے یہ لوگ محض اودھ پنچ کے نامہ نگار نہ تھے بلکہ اس کے جان نثاروں میں تھے اسے اپنا اخبار سمجھتے تھے اور کسی دوسرے اخبار میں لکھنا کسر شان سمجھتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ رنگ قائم نہ رہا۔ بقول شاعر ؎

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

دس بارہ سال بعد اودھ پنچ کے شباب کی دوپہر ڈھلنا شروع ہوئی اور اس کے نامہ نگاروں کا شیرازہ درہم و برہم ہونے لگا۔ ستم ظریف اور تجربے مرنے سے پہلے ہی لکھنا کم کر دیا تھا۔ جوانی کی بے فکری دوسرے نامہ نگاروں کا ساتھ عرصہ تک نہ دے سکی اور رفتہ رفتہ اودھ پنچ کے صفحے قدیم طرز کے پرانے مضامین سے خالی نظر آنے لگے۔ جو کچھ رہی تھی آب و تاب باقی تھی منشی سجاد حسین کی علالت نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس میں کلام نہیں کہ اس مٹی ہوئی حالت میں بھی اودھ پنچ کا نام بکتا تھا اور جب کبھی کوئی مضمون اس کے اڈیٹر کے قلم سے نکل جاتا تھا تو اس کی دھوم ہو جاتی تھی علاوہ اس کے کبھی کبھی منشی احمد علی شوقؔ، نواب سید محمد آزاد اور حضرت

اکبرؔ کے نظم و نثر کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ مگر اودھ پنچ کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ منشی سجاد حسین کی حمیت و غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ جب تک ان کی دم میں دم ہے وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بند ہوتا ہوا دیکھیں۔ مگر وہ وقفکار جانتے ہیں کہ آخر دس بارہ سال میں اودھ پنچ میں سوائے خسارے کے کوئی نفع کی مد نہ تھی۔ منشی صاحب موصوف نے ایک خط منشی بالمکند گپتا مرحوم کو لکھا تھا جو "زمانہ" میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اودھ پنچ کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں۔

"مکرمی۔ تسلیم۔

خط پہونچا۔ بہت بجا ہے۔ اودھ پنچ مردہ ہاتھوں سے اسلئے نکلتا ہے کہ کوئی اٹھانے والا نہیں۔ دو ایک سطروں کے سوا نہ ہاتھ سے لکھ سکتا ہوں نہ منہ سے بول سکتا ہوں۔ کچھ تو کر ہمت کر کے نکال دیتے ہیں۔ دس سال سے فالج میں گرفتار لبِ گور ہوں۔ جب کسی طرف سے اطمینان نہیں تو کیا انتظام ہو سکے۔ اخبار صرف اس لئے نکالتا ہوں کہ جیتے جی مر نہیں سکتا۔ ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں سے ع

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو۔ ہاں گذشتہ زمانہ میں کچھ تھا"

مگر یہ حالت کب تک قائم رہتی۔ آخر کار مرنے سے دو سال پیشتر شکستہ دل اڈیٹر کو اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھوں سے اٹھانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ضعیف جسم میں خون کے دس بیس قطرے ضرور باقی

تھے مگر گرہ میں ایک پیسہ نہ تھا۔ اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا۔ گو کہ باوضع اڈیٹر کی باوجود لب گو رہنے کے یہ تمنا ضرور رہتی کہ۔ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

خیر، اودھ پنچ کا جاری رہنا تو درکنار۔ یہ وہ نازک زمانہ تھا کہ اگر اودھ کا ایک عالی ظرف رئیس جس کی فیاضی ضرب المثل ہے دستگیری نہ کرتا اور دو ایک پرانے دوستوں کی محبت شریک حال نہ ہوتی تو شاید اودھ پنچ کا اڈیٹر نان شبینہ کا محتاج رہ کر دنیا سے سدھارتا۔

غرض کہ چھتیس سال تک زبان اور قوم کی خدمت کر کے اودھ پنچ نے دنیا کو خیر باد کہا اس وقت اردو زبان میں بہت سے قابل قدر اخبار موجود ہیں مگر اودھ پنچ کی جگہ خالی ہے۔ اور زمانے کا رنگ کہہ رہا ہے کہ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہیگی۔ مگر اردو زبان کی تاریخ میں یہ زندہ دلی کا افسانہ ایک یادگار افسانہ ہے اور اس کی یاد قدر دانوں کے دلوں سے آسانی سے فراموش نہیں ہو سکتی۔ آج اودھ پنچ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں۔ مگر اس کے تذکرے سے سخن سنجوں کی محفل خالی نہیں۔ ؎

پھر گئے آنکھوں میں مشتاق گذشتہ نشہ میں
دورِ جامِ مے میں اکثر ذکرِ خیرِ جسم ہوا

منشی سیّد محمّد سجّاد حسین

ایک خوشحال و عالی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد منشی منصور علی صاحب عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر معمور رہے اور بعد پنشن کے ایک عرصہ تک حیدر آباد میں سول جج رہے۔ آپ کے ماموں نواب فدا حسین خاں صاحب جو لکھنؤ کے ایک معزز وکیل تھے حیدر آباد میں بعہدہ چیف جسٹس ممتاز تھے اور ریاست میں آپ کا بہت اچھا رسوخ تھا۔ منشی سجاد حسین کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں زیر نگرانی نواب فدا حسین صاحب لکھنؤ میں تعلیم پاتے رہے۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور کچھ دنوں تک کیننگ کالج میں ایف۔ اے۔ کی تعلیم بھی پائی لیکن طبیعت انگریزی سے اچاٹ ہو گئی اور ایف اے کے امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ کالج چھوڑ کر تلاش معاش میں فیض آباد پہنچے اور وہاں فوج میں اردو پڑھانے پر منشی مقرر ہوئے۔ لیکن طبیعت کو اس شغل سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی سال بھر کے اندر ہی اس کو خیرباد کہہ کر اودھ پنچ کے شایع کرنے کا ارادہ کیا۔ منشی محفوظ علی صاحب جو بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور جن کی عنایت اور توجہ سے ہم کو یہ حالات معلوم ہوئے ہیں اس کام میں آپ کے شریک تھے اور انھیں کے مشورے و شرکت سے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی بنا پڑی۔ منشی صاحب نے پنچ کے لئے پہلے ہی سال میں ایسے ایسے سحر البیان و جادو قلم نامہ نگار ڈھونڈ نکالے کہ جو

اردو علم و ادب کے آسمان پر چاند و سورج ہو کر چمکے۔ ان میں سے پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ نواب سید محمد خاں صاحب آزاد۔ سید اکبر حسین صاحب اکبر و منشی احمد علی صاحب شوق۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی کسمنڈوی کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اول دو سال تک اپنے قلم جادو رقم سے اودھ پنچ کو سرفراز کرتے رہے۔ لیکن بعد میں آپس میں کچھ الجھن پیدا ہو گئی اور وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ منشی صاحب علی گڑھ کی تحریک و سر سید کی پالیسی کے اول روز سے مخالف تھے۔ نظامِ معاشرت میں قدامت پرستی کے قائل اور مغربی تہذیب کے دشمن تھے۔ ۱۸۸۷ء میں نیشنل کانگرس میں شریک ہوئے اور مرتے دم تک اس کے حامی رہے۔ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ فالج گرا لیکن چند ماہ بیمار رہ کر اچھے ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں فالج کا دوسرا دورہ ہوا کہ جس نے تندرستی ہمیشہ کے لئے تباہ کر دی۔ اس وقت سے بولنے کی قوت قریب قریب بالکل جاتی رہی تھی۔ گو گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر چل پھر سکتے تھے اور دماغ اپنا کام برابر کرتا تھا۔ متواتر علالت ضعف و دیگر تکدرات زندگی کی وجہ سے آخری زمانہ نہایت مصیبت و پریشانی کا گذرا۔ بالآخر ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد حالت روز بروز بری ہوتی گئی اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو اس دار المحن سے کوچ کیا۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرنے والے میں

منشی محمد سجاد حسین صاحب اردو اخبار نویسی میں طرز مذاق و ظرافت کے موجد۔ لکھنؤ کی زبان کے ماہر اور اپنے رنگ کے استاد تھے

اودھ پنچ کے ذریعہ سے جو خدمات اردو لٹریچر کی آپ نے کیں اور جو قابل قدر اضافہ اس زبان میں آپ کی کوششوں کی بدولت ہوا۔ اس قابل نہیں کہ آسانی سے بھلا دیا جائے۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنا دامن شہرت مذہبی تعصب سے خواہ پولٹیکل ہو یا لٹریچر ہمیشہ صاف و پاک رکھا اور آزادی و ایمانداری کو کبھی بھولے سے بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جو وضع اختیار کی اس کو مرتے دم تک نبھایا۔ کسی حالت میں اصول سے منہ نہ موڑا۔ بلا کی شوخ طبیعت پائی تھی۔ بذلہ سنجی و ظرافت تو گویا مزاج کا خمیر تھی۔ نہایت پریشانی و تنگی کی حالت میں بھی حتی المقدور خندہ پیشانی سے رہتے اور مذاق سے باز نہ آتے تھے۔ منشی جوالا پرشاد برق مرحوم سے نہایت درجے کی خصوصیت تھی۔ آپ کے قدردانوں میں پنڈت بشن نراین در۔ آنریبل راجہ سر محمد علی محمد خاں صاحب بہادر والی ریاست محمود آباد اور بابو گنگا پرشاد ورما مرحوم کے نام نامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

مرزا محمد مرتضیٰ نام عاشق تخلص عرف مچھو بیگ پنچ کے نامہ نگاروں میں ستم ظریف کے نام سے مشہور تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ مرزا عطاء اللہ بیگ معروف بہ نواب حسین علیخاں بہادر اٹک سے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ آپ کے

نانا مرزا اسد علی بیگ پادشاہ اودھ کی فوج میں کمندان تھے۔ مرزا صاحب
بچپن سے بائیس سال کی عمر تک نانا کے ہمراہ رہے اور اس وقت تک بجز
سپہ گری اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد بطور خود کافی علمی
لیاقت پیدا کر کے مشغلہ شعر و سخن کی جانب بھی توجہ شروع کی اور رفتہ
رفتہ اس فن شریف میں بھی اس قدر قدرت بہم پہونچائی کہ آپ کی زندگی
ہی میں آپ کا نام اردو زبان کے اساتذہ اور محققین کی فہرست میں
داخل ہو گیا تھا۔ آپ مرزا نسیم کے شاگردوں میں تھے۔
دراز قامت فربہ اندام صحیح و شدید القویٰ جسم و قوت کے اعتبار
سے د بقول حضرت حسرت موہانی) شاعروں میں ناسخ ثانی کے نام کے
مستحق بنے۔ رنگ البتہ ناسخ کے خلاف گندمی کھلتا ہوا تھا۔ دو پلّی ٹوپی
انگرکھا گھٹنا لکھنو کی معمولی وضع آپ کو بھی مرغوب تھی۔ لیکن آخر عمر میں
کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہن لیتے تھے۔ لطیف و ظریف خوش بیان و
خوش گفتار اپنے چھوٹوں سے بھی ظرافت کو دریغ نہ کرتے تھے۔ آپ کے
ملنے والوں میں پرانی وضع کے لوگوں میں اشرف علی صاحب اشرف
مرحوم۔ منشی امیر اللہ تسلیم وغیرہ اور نئی تہذیب کے لوگوں میں منشی جوالا
پرشاد برق۔ مسٹر حامد علیخاں بیرسٹر اور منشی محمد سجاد حسین صاحب تھے۔ صلح
کل و مرنجان مرنج کی یہ کیفیت تھی کہ مرتے دم تک بلکہ مرنے کے بعد بھی
لوگوں کو آپ کے اصلی مذہب کی کیفیت نہ معلوم ہوئی کہ سنی تھے کہ شیعہ
آپ کے شاگردوں میں منشی بالمکند گپتا مرحوم اڈیٹر اخبار "بھارت متر
کلکتہ"، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں کہ جس سے آپ کی ہردلعزیزی
و بے تعصبی کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت حسرت موہانی کہ جن کے لطف و کرم

سے یہ حالات زندگی مرزا صاحب کے ہم تک پہونچے ہیں فرماتے ہیں۔

"آپ کے نظم و نثر کے تمام کارنامے ہنگامہ ۵۷ء کے بعد کے ہیں مرزا نسیم مرحوم بھی اسی زمانہ میں دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے ان کی صحبت اور شاگردی نے سمند ناز پر تازیانے کا کام کیا۔ اور آپ کے ادبی مذاق کی خوبیوں نے روز افزوں ترقی کے ساتھ بالآخر وہ مرتبہ حاصل کیا کہ آپ نثر نگاری میں یکتائے روزگار اور سخن سنجی میں استاد قرار پائے۔ لکھنؤ کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ میں اس کی ابتدا سے لیکر اپنی آخر عمر تک ۳۳ سال برابر "ستم ظریف" کے فرضی نام سے ایسے دلچسپ مضامین لکھتے رہے جن کا ادبی اور تنقیدی حیثیت سے بے مثل و نظیر ہونا آج تک اہل قلم کے حلقے میں مسلم سمجھا جاتا ہے۔ تذکرۂ شعرا کے مانند جب کبھی اردو زبان کے نثر نگاروں کے حالات بھی مرتب کئے جائینگے اس وقت حضرت عاشق کا نام یقیناً طبقہ اول کے انشا پردازوں کی فہرست میں ممتاز نظر آئے گا۔ لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزائے مرحوم کو تھی اس کا اندازہ ان کی مشہور تالیف "بہار ہند" کے دیکھنے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ملک نے اس لغت کی کافی قدر نہ کی ورنہ اگر اس کے باقی تین حصے بھی چھپ جاتے تو اردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا مولوی حکیم الدین وکیل اکولا نے علم ادب کے متعلق اودھ پنچ سے آپ کے بعض مضامین کو نقل کر کے "چشمۂ بصیرت" نام ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دیا تھا مگر اب وہ کمیاب ہے گلزار نجات میلاد شریف نظم اور مثنوی نیرنگ خیال معروف کے علاوہ آپکا ایک ضخیم دیوان مشتمل بر جملہ اصناف سخن آپکے خلف رشید مرزا محمد صدیق صاحب صادق کے پاس موجود ہے۔

نواب سید محمد آزاد

مشرقی بنگال کے ایک سر برآوردہ اور دولتمند خاندان سے ہیں ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے اور اوائل عمر میں تعلیم بھی وہیں پائی فارسی و اردو کی تعلیم ایک نامی استاد یعنی آغا احمد علی اصفہانی مصنف "موید برہان"[1] کے زیر نگرانی پائی۔ آپ استاد کے نہایت رشید شاگردوں میں سے تھے۔ اس زمانہ میں اول تو انگریزی تعلیم کا چرچہ ویسے ہی بہت کم تھا۔ پھر بنگالے کے مسلمانوں میں تو صرف شاذونادر اصحاب اسطرف توجہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خط میں فرماتے ہیں۔

انگریزی میں مجھے انٹرنس فیل ہونے کی عزت بھی حاصل نہیں ہے۔ ہمارے وقت میں ہمارے شہر کے مسلمانوں کو انگریزی خوانی سے مطلق رغبت نہ تھی۔ میں نے تفنناً چند روز انگریزی پڑھی تھی اور ۳ سال کالج بھی گیا تھا۔ اس کے بعد پھر اپنے خسر معظم نواب عبداللطیف صاحب بہادر مرحوم کی صحبت بابرکت میں کلکتہ میں رہ کر کتب بینی

[1] غالب مرحوم نے برہان قاطع لغت کی رد میں ایک کتاب موسوم بہ قاطع برہان لکھی تھی اسکے جواب میں آغا احمد علی صاحب نے "موید برہان" لکھی تھی جس کا جواب مرزا صاحب نے تیغ تیز سے دیا تھا اور پھر اس کا جواب الجواب آغا صاحب نے شمشیر تیز تر سے دیا تھا۔ اس علمی معرکہ کا پورا قصہ مولانا حالی نے یادگار غالب میں بیان کیا ہے۔

سے کسی قدر انگریزی حاصل کی اور پھر نوکری اختیار کرنے کے بعد بشرطِ ضرورت اپنی انگریزی کی تکمیل کرتا رہا۔

سرکار انگریزی کی ملازمت عہدہ سب رجسٹراری سے شروع کی لیکن رفتہ رفتہ مختلف مدارج طے کرتے ہوئے کلکتہ کے پریسیڈنسی مجسٹریٹ اور آخر میں انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن ہوئے۔ دو دفعہ بنگال کونسل کے ممبر منجانب گورنمنٹ نامزد ہوئے۔ اور "آئی" "ایس" "او" کا خطاب پایا ۱۹۱۲ء میں اپنے فرائض سرکاری سے سبکدوش ہو کر پنشن لی اور اب کلکتہ میں تشریف فرما ہیں۔

اخبار بینی و مضامین نگاری کا شوق شروع ہی سے تھا۔ سب سے پہلے فارسی اخبار "دوربین" میں کہ جو "مسلم لٹریری سوسائٹی" کا پرچہ تھا۔ مضمون لکھنے شروع کئے۔ یہ نہایت نو مشقی کا زمانہ تھا۔ رفتہ رفتہ اردو میں مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ سب سے پہلے اودھ اخبار میں لکھنا شروع کیا اور ۱۸۷۴ء سے یہ سلسلہ برابر قائم رہا۔ اکثر مضامین آپ کے "اکمل اخبار دہلی" "آگرہ اخبار" "سفیر لودھیانہ" "اخبار الاخیار" میں بھی نکلے مگر آپ کی شہرت بھی اودھ پنچ کی شہرت کے ساتھ ہی ہوئی خاص کر آپ کا "نوابی دربار" کہ جو ۱۸۷۸ء میں بطور ناول کے پنچ میں شائع ہوا تھا۔ نہایت ہی مقبول ہوا۔ علاوہ بریں آپ کی "ڈکشنری" "مذہب نامہ" "پیام" اور "سوانح عمری مولانا آزاد" ایسے مضامین تھے کہ جنھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ اکثر مضامین آپ کے ایک جگہ ترتیب دے کر ایک جلد میں کہ جس کا نام "خیالات آزاد" ہے شائع ہوئے ہیں جن کی قدر بڑے بڑے لوگوں نے کی اور دور دور سے آپ کے

پاس مبارکباد کے خط آئے۔ انگریزی زبان میں بھی آپ نے مضامین نگاری کی اچھی خاصی مشق حاصل کی اور بابو شمبھو چندر ڈے کی صحبت سے اس بارے میں بہت ہی نفع اٹھایا۔ آپ اخبار رئیس و رعیت میں اکثر اڈیٹوریل مضامین لکھا کرتے تھے کہ جو سرکار اور رعایا دونوں کی نگاہ میں قابل قدر سمجھے گئے۔ غالباً پنچ کے نامہ نگاروں میں یہ فخر صرف آپ ہی کو حاصل ہے کہ تادم آخر آپ نے حق دوستی نبھایا اور برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔

منشی جوالا پرشاد برق

منشی جوالا پرشاد صاحب برق ضلع سیتاپور قصبہ محمدی میں پیدا ہوئے ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۳ء تاریخ ولادت ہے۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ محمدی میں گذرا ۱۸۷۸ء میں ضلع کھیری سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور وظیفہ پایا ۱۸۷۹ء سے کیننگ کالج میں تعلیم پاکر ۱۸۸۲ء میں بی۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا ۱۸۸۳ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کی اور فدائے قوم منشی کالی پرشاد مرحوم کے دامنِ عاطفت کے سایہ میں کچھ عرصہ تک وکالت کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۱۸۸۵ء کے آخری حصہ میں وکالت کا سلسلہ ترک کرکے منصفی کا عہدہ قبول کرلیا اور اس صیغہ میں خاطر خواہ نام آوری اور ترقی حاصل کی۔ اکثر اڈیشنل [illegible]ن جج اور

سشن جج کے عہدے پر بھی قائم مقامی کی حیثیت سے ممتاز رہے اور ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کی جانب سے گریول کمیٹی کے ممبر بھی مقرر ہوئے۔ مگر جب ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھنو میں بعارضہ طاعون انتقال کیا تو اس وقت ان کا مستقل عہدہ جج خفیفہ کا تھا۔ ان کے انتقال پر شمشیر صاحب جوڈیشل کمشنر نے کرسی عدالت سے فرمایا کہ قابلیت کے اعتبار سے اودھ کے سب ججوں میں بابو جوالا پرشاد اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

بابو جوالا پرشاد مرحوم خلقی طور سے نہایت ذہین اور طبّاع شخص تھے اور واقعی اسم بامسمیٰ برق تھے۔ اردو زبان اور شاعری کا شوق زمانہ طالبعلمی سے تھا۔ پہلا اردو کا مضمون تیرہ برس کے سن میں "کایستھ سماچار" میں لکھا تھا۔ مرحوم کے بھتیجے بابو کرشن کمار صاحب فرماتے تھے کہ جس زمانے میں منارہ آزاد نکلتا تھا بابو جوالا پرشاد لکھنو کی زبان حاصل کرنے کی غرض سے اس کا مطالعہ اس طرح کرتے تھے جس طرح کوئی طالبعلم اسکول کالج کی کتاب پڑھتا ہے۔ لکھنو میں آکر منشی جوالا پرشاد کی منشی سجاد حسین، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی احمد علی شوق سے ملاقات ہوئی اور اودھ پنچ میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ منشی صاحب موصوف ان معدودے چند لوگوں میں تھے۔ جنہوں نے ابتدا سے اودھ پنچ کے پودے کو سینچا۔ ان کی ذہانت اور طباعی ضرب المثل تھی اور زبان دانی اور شاعری کے اعتبار سے لکھنو کے سخن سنجوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ علاوہ چھوٹی چھوٹی نظموں کے جو اودھ پنچ میں اکثر شایع ہوئیں مثنوی بہار اور معشوقہ فرنگ جو کہ رومیو جولیٹ کا ترجمہ ہے ان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ مثنوی بہار کی دلچسپی

اور اختصار کو دیکھ کر سر سید احمد خان مرحوم نے یہ فرمایا تھا کہ

"روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد"

یہ ایسی سند تھی جس پر ہر شخص کو ناز ہو سکتا تھا۔

بابو جوالا پرشاد نے بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناولوں کا ترجمہ اس صفائی سے اور ایسی سلیس عبارت میں کیا ہے کہ اکثر بنگالی حضرات کو یہ کہتے سنا کہ ترجمہ میں اصل قصہ کی تازگی موجود ہے۔ بنگالی دلہن، پرتاب، مار آستین، روہنی، اصل میں بنگالی زبان کے قصے ہیں۔ جن کی تصویر اردو زبان میں اتاری گئی۔ علاوہ ان ترجموں کے منشی صاحب مرحوم نے انگریزی زبان کے خدائے سخن شیکسپیر کے نو یا دس ناٹکوں کا ہو بہو لفظی ترجمہ نہایت سلیس نثر میں کیا ہے اور اگر زندگی وفا کرتی تو ان کا یہ ارادہ تھا کہ اسی عنوان سے شیکسپیر کے تمام ناٹکوں کا ترجمہ کر ڈالتے مگر ۱۹۰۵ء میں اس کام کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۱۱ء میں ان کی زندگی کا افسانہ ختم ہو گیا۔

علاوہ منشی سجاد حسین اور منشی احمد علی شوق کے پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم، بابو جوالا پرشاد کے بڑے گہرے دوستوں میں تھے۔ اودھ پنچ میں دونوں کے مضامین کا کثیر حصہ اس وقت کا لکھا ہوا ہے جب کہ قیصر گنج میں پنڈت تربھون ناتھ وکالت کرتے تھے اور بابو جوالا پرشاد منصف تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دونوں رنگین مزاج دوستوں کے لئے ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات تھی

اردو شاعری

کسی استاد کا شعر ہے۔

اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ وہ طلائی کا

ہمارے عزیزان وطن نے جب غیر قوم کی اطاعت قبول کی تو انہیں بھی دو قسم کی زنجیریں پہننا پڑیں۔ فرمانروا قوم کے قانون کے پردے میں جو پابندیاں انھیں برداشت کرنا پڑیں انھیں لوہے کی زنجیر سمجھنا چاہیئے زبان و قلم کی کامل آزادی سے محروم رہنا انتظام حکومت میں شریک نہ ہونا قومی آرام و آسایش کے کافی ذریعوں کی فکر میں گرفتار رہنا ان قانونی پابندیوں کا نتیجہ تھا یہ ایسی گرفتاری تھی جو ہمارے اہل وطن ہمیشہ کم و بیش محسوس کرتے رہے اور اپنی قومی آزادی کے لئے دعا و فریاد کے نعرے بلند کیا کئے۔ پولٹیکل بحث و تحریک کے کارنامے ان لوہے کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی کوشش کے افسانے ہیں۔ مگر ان ظاہری پابندیوں سے بہت زیادہ قابل عبرت خیالات کی غلامی تھی جس نے غیر قوم کی حکومت کا سکہ ہمارے دل و دماغ پر جاری کر دیا۔ ہمارے جذبات و خیالات مغربی تہذیب کے مصنوعی اور نمائشی

رنگ میں گرفتار ہو گئے اور ہم اپنے قومی حفظ مراتب سے بے خبر ہو گئے۔ میں اس خیالات کی غلامی کے سلسلہ کو سونے کی زنجیر کہوں گا۔ جسے ہم نے خوشی سے پہن لیا اور اپنی گرفتاری پر ناز کرنے لگے۔

اس دماغی اور روحانی غلامی نے طبیعتوں کا رنگ کچھ ایسا پلٹ دیا کہ ہم حکمران قوم کے انداز معاشرت کی تقلید کو تہذیب و تربیت کا جوہر سمجھنے لگے۔ قومی وقار کا سودا ہمارے سروں سے رخصت ہو گیا۔ اکثر صورتوں میں ہمیں اپنے اخلاق و مذہب سے بھی شرم آنے لگی۔ اس قومی بے خبری کے عالم میں ہمیں اپنے قدیم ادب یا لٹریچر سے بھی حجاب آنے لگا انگریزی زبان میں کمال پیدا کرنا تعلیم و تربیت کا معیار ہو گیا۔ اردو یا ہندی کی زباندانی کی یاد تنگ دل سے فراموش ہونے لگی۔ ایسے اہل قلم و اہل زبان پیدا ہو گئے جو انگریزی میں فصاحت کے دریا بہا سکتے تھے مگر اپنی مادری زبان کو جنت نصیب بزرگوں کی ناواقفیت و کم نصیبی کا ورثہ سمجھتے تھے جیسا کہ لازمی تھا۔ اردو زبان اور اردو شاعری کا سفینہ بھی ڈگمگانے لگا۔ یہ صدائیں عام ہو گئیں کہ قدیم رنگ کی اردو شاعری میں سوائے گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کے مضامین کے کیا رکھا ہے۔ اکثر انگریز مصنفین نے اردو زبان یا شاعری کے بارے میں جو خامہ فرسائی کی ہے اس کا لفظ لفظ ہمارے ناواقف نوجوانوں کے لئے قرآن و حدیث ہو گیا اور انھوں نے اپنے مغربی استادوں کے خیالات کی غلامی بلا تکلف قبول کر لی۔ جس طرح زندگی کے اکثر شعبوں میں مغربی تہذیب کا نمائشی پہلو ہماری نظروں میں سما گیا تھا۔ اور اصلی جوہروں سے نگاہیں آشنا نہ تھیں۔ اسی طرح انگریزی نظم کے ظاہری

رنگ وروپ کو ہم حسن سخن کا معیار سمجھنے لگے اور چونکہ اردو شاعری اس معیار کے کانٹے میں تل نہ سکی لہٰذا وہ قابل نفریں قرار دی گئی۔

اردو شاعری کے فروغ کا آغاز اسلامی تہذیب کے آخری دور میں ہوا۔ جب کہ عیش پرستی وکاہلی نے ہمارے ہم وطنوں کے خیالات وجذبات کی روحانی آگ کو قریب قریب ٹھنڈا کر دیا تھا۔ قومی زندگی کی نبض سست ہو چکی تھی۔ جو کچھ بلند خیالی وضعداری اور عالی حوصلگی کے جوہر باقی رہ گئے تھے ان کی ہستی بجھتے ہوئے چراغوں کی روشنی سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اس بدنصیبی کے دور میں اردو زبان کی خوش قسمتی سے چند ایسے باکمال پیدا ہو گئے جو شاعری اور زباندانی کے جوہر اپنے ساتھ لائے تھے اور جن کے دلوں میں اس قومی زوال کے زمانے میں بھی اپنے بزرگوں کی قدیم حمیت وتہذیب کا اثر باقی تھا۔ میرؔ وسوداؔ آتشؔ وغالبؔ وانیسؔ نے اپنی شاعری سے جو چراغ روشن کئے انہیں زمانے کی ہوا ابھی پورے طور سے گل نہیں کر سکی ہے۔ مگر باوجود ان قدرتی جوہروں کے زمانے کا رنگ ان کے کمال کا دشمن تھا۔ جس دنیا میں وہ رہتے تھے اس کے عام پسند خیالات وجذبات کے ملغوں میں ان کے دل ودماغ جکڑے ہوئے تھے۔ اکثر وہ ان پابندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر اپنی قومی تہذیب وتربیت کے محدود دائرے سے مجبور ہو جاتے تھے۔ شاید یہی خیال غالبؔ کے دل کو ستا رہا تھا۔ جب اس نے یہ شعر کہا۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل\
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

یا میر انیس نے انھیں پابندیوں سے عاجز آکر مرثیہ کا وسیع میدان تلاش کیا لیکن باوجود ان امنگوں کے ہمارے قدیم شاعروں کے مذاق سخن کے آئینہ پر بہت کچھ مصنوعی شاعری کا گرد و غبار جم گیا اور اُن کا دامن اکثر غیر پاکیزہ خیالات و جذبات کے کانٹوں سے الجھ کر رہ گیا اگر زمانہ کروٹ لیتا اور قومی زندگی میں شاعرانہ مذاق کی ترقی کا پہلو قائم رہتا تو بعد کی نسل قدیم شعرا کے جوہروں کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتی اور جو عیب ان کے کلام میں موجود تھے ان سے زبان و شاعری کو پاک کر دیتی۔ مگر دنیا دوسرے رنگ پر جا رہی تھی۔ نئی تہذیب کی اشاعت نے طبیعتوں کا رنگ کچھ اس طرح بدل دیا تھا کہ صحیح مذاق سخن کا قائم ہونا دشوار تھا۔

انگریزی تعلیم نے ملک میں رفتہ رفتہ جو بیداری پیدا کی ہے اسے بھول جانا قومی احسان فراموشی ہے۔ مگر اس تعلیم کا ایک صریحی اثر ہمارے قومی اخلاق پر بہت خراب پڑھا۔ وہ یہ تھا کہ تعلیم محض ذریعہ معاش ہو گئی۔ علم و ادب کی تحصیل سے جو روحانی سرور کا سرمایہ دلوں کو حاصل ہوتا ہے وہ بالکل نظر انداز ہو گیا۔ اس زمانے میں کثرت سے ایسے تعلیم یافتہ بزرگ ملیں گے جنھیں اردو فارسی ہندی یا انگریزی کے مذاق سخن سے ذرا بھی حس نہیں ہے۔ ان کی زندگی شاعرانہ لطافت کے اثر سے بالکل خالی ہے۔ تعلیم نے ان کی آنکھیں صرف اس قدر روشن کر دی ہیں کہ وہ کھوٹے کھرے روپیہ کو پرکھ سکیں۔ قومی مفلسی نے تعلیم کے اس تجارتی شوق پر اور تازیانہ لگانے کا کام کیا ہے وہ لطیف جذبات و خیالات جن کا تازہ کرنا تعلیم کا اصلی منشا ہے اور جن کی نشو و نما سے انسان دنیا

کے گرد و غبار سے ہٹ کر روحانی لطافتوں کا خط اٹھا سکتا ہے۔ روز بروز سرد ہو جاتے ہیں۔ اس تجارتی تعلیم کے طوفان میں جب کہ شاعرانہ جذبات کی ترتیب کی اصلاح کا راستہ ہی بند ہو رہا ہے۔ مذاق سخن کی صحت کی امید رکھنا فضول ہے۔

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مذاق سخن صحیح و درست نہیں ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات عموماً اردو فارسی ہندی یا سنسکرت کی شاعری سے نا آشنا ہیں۔ انھوں نے اپنا مذاق سخن انگریزی نظم کے مطالعہ سے قائم کیا ہے لیکن ان کے معیار سخن کا دار و مدار بہت کچھ انگریزی شاعری کی غلط تعبیر پر ہے۔ انگریزی نظم کے اس لطیف پہلو سے پورے طور پر آشنا نہیں ہیں جس کی بنیاد جذبات کی لطافت و نزاکت پر ہے اور جو اصلی جزو شاعری ہے انگریزی نظم ان کے دماغ کو ضرور روشن کر دیتی ہے مگر ان کے دلوں میں جذبات کی آگ نہیں بھڑکاتی۔ چنانچہ نئی تعلیم کے معصوم بندے یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ شاعری کی وقعت کا دار و مدار محض خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر ہے۔ انگریزی نظموں میں آزادی و حب الوطنی کے خیالات دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں انھیں اس قسم کے خیالات کا پتہ نہیں ملتا لہٰذا اس کے مطالعہ کا بار ان کی نگاہیں نہیں اٹھا سکتیں۔

نفس شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے یہ ویسا ہے کہ سریلی آواز کے سننے سے یا دریا کی لہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری

وزبان کے جادو کی تشریح وتعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے۔

بقول شاعر ؎

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زبان دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

مگر بادی النظر میں شاعری کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق خیالات سے ہے۔ دوسرے کا زبان سے ہے۔ جس کو خیالات کا پیرہن یا لباس سمجھنا چاہیئے۔ خیالات کا اظہار پاکیزہ اور سلیس نثر میں بھی لطافت کیساتھ ہو سکتا ہے مگر شاعر کے خیالات دلی جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلتے ہیں۔ اور زبان میں خاص تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعرانہ خیالات کے پھولوں کی نشو ونما محض دماغ کی پھلواری تک محدود نہیں رہتی ہے شاعر کے دلی جذبات کی برقی حرارت ان پھولوں کا عطر کھینچ لیتی ہے۔ اسی کا نام شاعرانہ تاثیر و لطافت ہے۔ اس شاعرانہ لطافت و تاثیر کے عام کرنے کا ذریعہ شاعرانہ زبان ہے۔ شاعر بھی وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس کے ہم وطنوں کی زبان پر ہوتے ہیں مگر انھیں الفاظ کی الٹ پھیر سے وہ اپنے بیان میں عالم تصویر پیدا کر دیتا ہے اور محض عالم تصویر ہی نہیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے الفاظ میں ایک راگ کی تاثیر نمایاں ہو جاتی ہے جو فن موسیقی کی راگ راگنی سے الگ ہے۔ اگر انگریزی شاعری کو اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات مغربی نظم کے پڑھنے سے دماغی حظ ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن نہ انداز کلام کی شاعرانہ لطافت ان کے دلوں میں برقی حرارت پیدا کرتی ہے نہ زبان کی مصوری کا انھیں حس ہوتا ہے نہ الفاظ کا راگ ان کے کانوں

کی فضا میں سماتا ہے۔ ان کا دماغ یہ خوب پہچان لیتا ہے کہ کس قسم کے خیالات نظم کئے گئے ہیں مگر ان کا دل جیسے جذبات کا ذخیرہ خیال کرنا چاہیئے۔ یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان خیالات کے ادا کرنے کا شاعرانہ انداز کیا ہے۔ ان کے کان یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر نے معمولی الفاظ میں کیا جادو بھر دیا ہے۔

ایسا ہونا ایک حد تک لازمی ہے جس زبان میں انگریزی شاعری ہے اس زبان کے الفاظ سے ہمارے کان قدرتی طور سے غیر مانوس ہیں ان کا قدرتی نغمہ ہمارے لئے خلق نہیں ہوا تھا۔ جس تہذیب کے عالم میں مغربی شاعروں کے رنج و راحت کے جذبات نے نشوونما پائی۔ ہماری سوسائٹی کی دنیا اس سے دور اور الگ ہے۔ مغربی دنیا کے قدیم مذہبی اور قومی کارنامے جو وہاں کے سورماؤں اور پیمبران دین کی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کی بدولت وہاں کے اکثر دریا یا پہاڑ یا اکثر قدرتی منظر قومی شاعری کے سرمایۂ ناز ہو گئے ہیں۔ ہمارے دلوں میں تاثیر کی گرمی نہیں پیدا کر سکتے۔ ایسی حالت میں مغربی نظم کے اصلی شاعرانہ پہلو کا اندازہ کرنا جس کا تعلق خاص جذبات سے ہے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

ممکن ہے چند ایسے ارباب وطن ہوں جنہوں نے ہندوستان کی بود و باش کی وجہ سے اور قدرتی ذہانت کے صدقہ میں مغربی سوسائٹی کے قومی و مذہبی خیالات و جذبات کا رنگ پورے طور سے پہچان لیا ہو اور جنہوں نے انگریزی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہو کہ انہیں اس ساز کے تمام پردوں سے واقفیت حاصل ہو گئی ہو۔ ایسے حضرات انگریزی نظم کی شاعرانہ لطافت سے ضرور حظ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر عام طور سے شیکسپیر

وبلٹن کی جو ثنا و صفت انگریزی دان نوجوانوں کی زبان سے سننے میں آتی ہے وہ بہت کچھ فرہنگوں کی بدولت ہوا کرتی ہے۔ میر تقی میر جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو یہاں کے چند بزرگ ان سے ملنے گئے اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے کہا کہ آپ حضرات میرا کلام سمجھ نہیں سکتے۔ بیچارے اپنا طیش ضبط نہ کر سکے اور کہہ اٹھے کہ جناب ہم فردوسی و نظامی کا کلام سمجھ سکتے ہیں مگر آپ کا کلام ایسا ہے کہ اس کی قدردانی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ فردوسی و نظامی کے کلام کی فرہنگیں چھپ گئی ہیں مگر میرے کلام کی ابھی کوئی فرہنگ نہیں چھپی ہے اسلئے آپ اس کی خوبی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ عام طور سے انگریزی نظم کے قدردانوں کی حالت اس سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ فرہنگ کے مطالعہ سے شیکسپیر کے کلام پر وجد کرنا سیکھ لیں مگر وہ اس قدردانی کے جذبہ کا اندازہ نہیں کر سکتے جس نے کارلائل کو یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ اگر اس سے پوچھا جائے کہ اسے ہندوستان کی سلطنت زیادہ عزیز ہے کہ شیکسپیر تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ چاہے ہندوستان کی سلطنت نکل جائے مگر انگریزی قوم شیکسپیر کا دامن نہیں چھوڑ سکتی۔

یہ خامی ہمارے لئے باعث شرم نہیں ہے۔ کوئی انگریز کتنا ہی ہندی زبان سے واقف کیوں نہو مگر تلسی داس کی شاعری کا اثر و نغمہ اس کے دل میں وہ کیفیت نہیں پیدا کر سکتا جسکا لطف ان پڑھ ہندو رامائن کے طفیل میں روز مرہ اٹھاتے ہیں۔ غیر ملک کا باشندہ تلسی داس کے خیالات کی بلندی و پاکیزگی کی داد دے سکتا ہے مگر زبان و شاعری کے جوہروں کو نہیں پرکھ سکتا نہ ان جذبات کی تاثیر قبول کر سکتا ہے جو ہندوؤں کی قومی تہذیب نے ٹکسالی کئے ہیں۔ اس قدر خامی کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جس حالت میں ہم اپنی مادری زبان کی شاعری سے حظ نہیں اٹھا سکتے ہمارے لئے کسی غیر زبان کے

مذاق سخن کی قدر شناسی سخت دشوار ہے۔ شاعری سے حظ اٹھانے کے لئے دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو انسان کے دل میں قدرتی طور سے شاعرانہ مذاق کا جوہر موجود ہو یا اس کے جذبات کی تربیت و اصلاح سے اس کی طبعیت میں سخن فہمی کا سلیقہ پیدا ہو گیا ہو۔ شاعرانہ نزاکت و لطافت کا حظ حاصل کرنے کیلئے محض دماغی تربیت کافی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ انسان کا دماغ فلسفہ و منطق کے نور سے آئینہ ہو مگر شاعرانہ مذاق کے جوہر سے خالی ہو۔ خیالات و زبان کی شاعرانہ لطافت کا اثر قبول کرنیکے لئے انسان کی ہستی کے اس جزو لطیف کے نشو و نما کی ضرورت ہے جس کا تعلق جذبات سے ہے جس طرح فلسفہ و ریاضی کی باریکیوں کے سمجھنے کیلئے خاص قسم کی دماغی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح طبعیت میں شاعرانہ مذاق سے دلچسپی پیدا کرنیکے لئے فطری جذبات کی اصلاح و تربیت لازمی ہے۔ اپنی زبان کی شاعری کے مطالعہ سے اس قسم کی اصلاح و تربیت کا سر انجام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ مادری زبان کے الفاظ کا نغمہ کانوں میں بلا تکلف گھر کر لیتا ہے اور قومی شاعروں کے کلام میں جو رنج و راحت کے جذبات کے نشتر موجود ہیں وہ دل میں چبھ جاتے ہیں اور دبی ہوئی امنگوں کو بیدار کر دیتے ہیں اسی کا نام شاعری درتربیت ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ بغیر اس تربیت کے محض غیر زبان کی فرہنگوں میں نفس شاعری کے متعلق مضامین پڑھ کر صحیح مذاق سخن قائم کر لے تو یہ اسی کی خوش قسمتی ہے۔

افسوس ہے تو اسقدر کہ یہ خوش قسمتی ہمارے حصے میں نہیں آئی۔ ہمارے تعلیم یافتہ عزیزان وطن نے اپنی زبان و شاعری سے بیخبر رہکر انگریزی شاعری کا جو غیر صحیح اندازہ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا مذاق سخن بگڑ گیا۔ ہمیں اپنی قدیم شاعری کے قابل قدر ذخیرے سے شرم آنے لگی اور نئی شاعری

کے لقب سے جب طرز کلام کی بنیاد پڑی اس کی وقعت نثر نظم نما سے زیادہ نہ تھی۔ یہ خیال عالمگیر ہو گیا کہ محض بلند و پاکیزہ خیالات کا برے بھلے الفاظ میں نظم کر لینا معراج شاعری ہے جذبات کی لطافت کا خیال نظر انداز ہو گیا۔ زبان کے نغمے سے کان ناآشنا ہو گئے۔ محض ننگے بوچے خیالات کی تصویریں کاغذ کے صفحوں پر نظر آنے لگیں

اردو زبان پر مولانا حالی کا جو احسان ہے اس کی یاد دلوں میں ہمیشہ تازہ رہیگی۔ مولانا مرحوم غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ آواز بلند کی کہ زمانے کے ساتھ اردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہیئے اور یہ معمولی بات نہ تھی۔ مگر اپنے انگریزی دان احباب کی مدد سے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موصوف نے قائم کیا اور جس کے سانچے میں اردو شاعری کو ڈھالنا چاہا وہ اس عیب سے خالی نہ تھا جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے۔ اس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مولانا کی ایک رباعی اس وقت تمثیلاً یاد آگئی ہے

دھوبی کی ہے لے رفار مرجا باقی — کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے کپڑے کو پہ اتنا نہ رگڑ — دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

جو خیال ان دو شعروں میں نظم کیا گیا ہے وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا اصول اصلاح ظاہر کرتا ہے۔ مگر اظہار خیال کا طریقہ شاعرانہ نہیں ہے۔ اگر پاکیزہ و سلیس نثر میں یہ خیال ادا کیا جائے تو اس نظم سے زیادہ دلکش ثابت ہوگا۔ ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مولانا حالی نے اردو شاعری کی اصلاح میں اپنے اصول اصلاح کو مد نظر نہیں رکھا۔ اردو شاعری کے دامن پر جو داغ اور دھبے تھے انہیں اس طرح صاف کرنے کی کوشش کی کہ نہ داغ دھبے باقی رہے نہ دامن کا ایک تار باقی رہا۔

قدیم اردو شعرا کے کلام میں بہتیرے ایسے خیالات ملینگے جنھیں موجودہ مذاق قبول نہیں کر سکتا یا جو موجودہ معیار کے مطابق پایۂ تہذیب سے

گرے ہوئے ہیں۔ مگر محض خیالات کی پستی سے تنگ آکر ہمیں ان کے شاعرانہ جوہر کو نہ بھول جانا چاہئے۔ اور یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ محض پند و نصائح نظم کرنے کا نام شاعری ہے۔ قدیم اردو شاعروں کے خیالات بلند نہ ہوں مگر انکا انداز سخن شاعرانہ ہے۔ ان کی زبان شاعرانہ تاثیر کا ذخیرہ ہے۔ جو مضامین وہ نظم کرتے ہیں ان میں ان کے دلی جذبات کا پرتو نظر آتا ہے یہی شاعری ہے۔

اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو ان کی شاعری کا قصور نہ تھا۔ بلکہ اپنی قومی بیخبری کے عالم میں جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات میں مغربی تہذیب کے اکثر اصولوں کی غلط تعبیر کی وہاں انگریزی شاعری کے غیر صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاق سخن بھی الٹا سیدھا قائم کر لیا۔ زبان و شاعری کی آئندہ اصلاح و ترقی کے لئے قدیم شعرا کے انداز سخن اور رنگ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ جب غیر صحیح مذاق سخن کی بنیاد پر قدیم رنگ سخن کی قدر نہ کر سکے اس کی مدد سے ہم زبان و شاعری میں نئے جوہر نہیں پیدا کر سکتے۔

ختم شد

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	نمبر شمار

ALLAMA IQBAL LIBRARY
46633

ہمارا شاندار ادبی کارنامہ

اردو زبان کی ام اللغات یعنی فرہنگ آصفیہ کی نشأۃ ثانیہ ہے چونکہ مکمل جلدیں بہت قلیل تعداد میں تیار ہو رہی ہیں لہذا آج ہی سے اس کے خریدار بننے کی کوشش کیجئے۔

عزیز احمد منشی فاضل
ایوان ادب اردو حویلی قدیم حیدرآباد دکن۔

بہترین طباعت و کتابت

مقصود ہو تو

حمیدیہ پریس چھتہ بازار

حیدرآباد دکن کی
خدمات حاصل فرمائیے۔

نیز۔ عرائض و قطعات وغیرہ خوشخط لکھے جاتے ہیں

J. & K UNIVERSITY LIB.
Acc No 46633
Date 14.7.67

THE UNIVERSITY OF KASHMIR
ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN